جولائی ۱۹۷۳ء

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد (۷۹) | جولائی ۱۹۷۳ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۳۹۳ھ | عدد (۵)

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ لاہور

زرِ سالانہ: دس روپیہ ——— فی پرچہ: ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔ پرنٹر:۔ محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آج سے تیئس برس پیشتر جب اسلامیہ پارک کی ایک مختصر سی کوٹھی میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی تو داعیٔ تحریکِ اسلامی نے جن کے کندھوں پر متفقہ طور پر امارت کا گراں بوجھ بھی ڈالا گیا شرکاءِ اجلاس کو مستقبل کے خطرات سے آگاہ کیا۔ ترجمان القرآن میں جب یہ روداد شائع ہوئی تو ہم سب دوستوں کو جو اس وقت کالج میں زیرِ تعلیم تھے، یہ سارے خطرات موہوم نظر آئے۔ ہم اکثر یہ سوچتے تھے کہ آخر اس نیک اور مقدس کام کی کون بے وقوف مخالفت کرے گا۔ بندوں کی بندگی سے نکل کر خدا کی بندگی اختیار کرتے ہیں آخر کسے تامل ہوگا؟ خیر اور بھلائی کو بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھ کر کس کا دل ناشاد ہوگا اور کون فلاح و بہبود کے اس کام میں تعاون کرنے سے گریز کرے گا؟ مگر جس وقت تحریکِ اسلامی کا قافلہ رواں دواں ہوا تو ہمارے ناپختہ ذہنوں کی توقعات کے عین برعکس ہمیں یہ محسوس ہونے لگا کہ لوگ نہ صرف اس دعوت کو قبول کرنے سے گریزاں ہیں بلکہ مختلف سمتوں سے اس کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بعد میں جب مطالعہ و مشاہدہ میں ذرا وسعت پیدا ہوئی اور قرآن مجید کی دعوت اور انبیاء علیہم السلام اور دوسرے صلحاء کے حالات پڑھنے کا موقع میسر آیا اور انسانی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے کی توفیق نصیب ہوئی تو اس وقت یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جس مقدس کام کے بارے میں ہم یہ حسن ظن رکھتے تھے کہ یہ بغیر کسی مزاحمت کے آگے بڑھے گا اور انسانوں کی بھاری تعداد اور خاص طور پر امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس قافلے کا والہانہ استقبال کرے گی اور اس کا ہر فرد بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اسے منزلِ مقصود کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا، وہ محض خام خیالی تھی جسے ہماری ذہنی ناپختگی نے جنم دیا تھا۔ اگر یہ کام اتنا آسان ہوتا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کو، جو فی الحقیقت پوری انسانیت کا جوہر تھے، کبھی اتنی دشواریاں پیش نہ آتیں، جن سے وہ قدم قدم پر دوچار ہوئے اور انہیں کبھی انسانیت کے ہاتھوں، جس کی بھلائی کے لیے وہ بھرپور جدوجہد کر رہے تھے، وہ ناقابلِ بیان دکھ نہ

اٹھانے پڑتے جو انہیں اس کارِ خیر کو انجام دیتے ہوئے اٹھانے پڑے۔

پوری انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ گو بندگیٔ رب کا جذبہ انسان کا بالکل فطری جذبہ ہے اور اس بنا پر اس کی دعوت انسانی فطرت کی عین پکار ہے مگر اپنی فطرت سے اس قدر قربت اور مناسبت کے باوجود انسان کو بندگیٔ رب کے تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ کرنا اور اسے اس راہ پر لگا دینا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ شیطان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے انسانوں کو اپنی فطرت کا اگر یکسر باغی نہیں بنایا تو انہیں آمادۂ بغاوت ضرور کیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ خود اپنی دشمنی پر اتر آتے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو برباد کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں پھر شیطان کے اس کارنامے کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ کھلے دشمن کے طور پر بہت کم حملے کرتا ہے بلکہ انسان کا رفیق اور خیر خواہ بن کر اس کے ساتھ دوستی پیدا کر کے اُس کے اندر گھستا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے جسم میں اسی طرح گردش کرنے لگتا ہے جس طرح کہ رگوں میں خون اور وہاں اتنا شدید بگاڑ پیدا کرتا ہے کہ معتقدات سے لے کر اعمال کی چھوٹی چھوٹی جزئیات تک میں کوئی چیز انسان کی فطرت کے مطابق نہیں رہتی بلکہ پورے کا پورا انسان اندر سے مسخ ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر کمال یہ ہے کہ یہ دشمنِ انسان اس کے اندر احساسِ زیاں تک پیدا نہیں ہونے دیتا۔ وہ کفر و شرک ضلالت و گمراہی اور ظلم و عدوان کی ہر وادی میں بھٹکتا ہے مگر اس غلط فہمی کا برابر شکار رہتا ہے کہ وہ فلاح و کامرانی کی منازل طے کر رہا ہے۔ وہ خدا سے بغاوت کرتا ہے اور قدرت اسے اس جرم کا یہ مزہ چکھاتی ہے کہ اُسے چند حقیر دنیوی مفادات کی خاطر ذلیل سے ذلیل انسانوں کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے مگر اُس کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ وہ آرٹ کے نام پر فحاشی پھیلاتا ہے مادہ آزادی کے نام پر اخلاقی حدود و قیود کو توڑتا ہے اور اپنے ان کرتوتوں کے خوفناک نتائج اپنے سامنے دیکھتے ہوئے بھی عبرت حاصل نہیں کرتا۔ اس قسم کے نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں جو لوگ بھی انسانی فلاح و بہبود کے اس نیک کام کا عزم لے کر اُٹھیں اُنہیں اپنے اندر اگر زیادہ نہیں تو وہ کم از کم صفات تو ضرور پیدا کرنی چاہئیں جو اس قافلہ میں شریک انسانوں کے لیے نہایت ضروری زادِ سفر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان صفات میں سب سے بنیادی اور نمایاں صفت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ہر کارکن کو اس بات کا پوری طرح

یقین ہونا چاہیے کہ جس دعوت کو وہ لے کر اُٹھا ہے یہ وہی دعوت ہے جسے بلند کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ اس دعوتِ حق کو قبول کرنے میں ہی انسانیت کی دنیوی اور اُخروی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ اس دعوت کے علاوہ ہر دوسری دعوت انسانیت کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحجرات: ۱۵)

مومن تو حقیقت میں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔

اس راہ کا اصل سرمایہ ایمانِ کامل اور دعوتِ حق پر یقینِ محکم ہے۔ اس کے بغیر اس پر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ ایمانِ کامل درحقیقت وہی ہے جس پر شک و تذبذب کا سایہ تک نہ پڑا ہو۔ ایسا ایمان ہی مومن میں یہ حوصلہ اور عزم پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی جان و مال سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر کے اس کے حضور میں بڑے ادب سے کہتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟

اس حقیقت کو حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے:

ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا۔ (صحیح مسلم)

جو شخص اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین (برحق) ہونے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہونے پر دل و جان سے راضی ہوا۔ اس نے فی الحقیقت ایمان کا مزہ چکھا۔

دین کی راہ چونکہ پھولوں کی سیج نہیں بلکہ ایک نہایت کٹھن منزل ہے اس لیے قرآن و سنت میں اس راہ میں استقامت دکھانے پر بے حد زور دیا گیا ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ (الشوریٰ: ۱۵)

پس اے رسول انہیں اسی حق کی دعوت دیتے رہیئے اور آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اسی پر جمے رہیئے۔ اور ان کی خواہشوں کو ہرگز نہ مانیئے اور کہہ دیجئے کہ اللہ نے جو کتاب نازل فرمائی ہے میں اس پہ ایمان رکھتا ہوں اور مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں

یعنی اہلِ باطل کی خواہشات کچھ بھی ہوں اہلِ حق کا منصب یہ ہے کہ وہ برابر حق کی دعوت پیش کرتے رہیں۔ حق پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور باطل کے ساتھ کسی مصالحت پر آمادہ نہ ہوں کیونکہ اگر انہوں نے باطل کے ساتھ سازگاری پیدا کرلی تو پھر حق کس طرح بلند ہوگا۔

خود حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دعوت کی مشکلات کا کتنا واضح شعور اور احساس تھا اس کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ایک دن حضرت (عبداللہ) خباب بن الارت نے دربارِ رسالت میں عرض کی کہ آپ ہمارے لیے بارگاہِ الٰہی سے مدد کی دعا کیوں نہیں کرتے آپؐ اس وقت کعبہ کے سائے میں چادر سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ حضرت خباب کی یہ عرضداشت سن کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ اگلی امتوں میں آدمی پکڑے جاتے پھر اُن کے لیے گڑھے کھودے جاتے تھے اور ان میں اُنہیں لٹایا جاتا تھا۔ اور آرہ ان کے سروں پر رکھ کر سر کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے۔ اور لوہے کی کنگھی اُن کے سروں پر اس زور سے پھیری جاتی جو ہڈی اور گوشت میں دھنستی ہوئی نکل جاتی۔ مگر یہ تکالیف اُنہیں اُن کے دین سے ہٹا نہ سکیں خدا کی قسم اللہ تعالیٰ اس کام کو ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت کی طرف چلے گا۔ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے گا۔ ہاں اسے اپنی بھیڑ بکریوں کے معاملے میں بھیڑیے کا خوف ہو سکتا ہے۔ مگر تم جلد بازی کرتے ہو۔

دعوتِ حق کی اساس چونکہ رضائے الٰہی کا حصول ہے اس لیے جو لوگ بھی اس دعوت کو صحیح مان کر اُسے سربلند کرنے کا عزم رکھتے ہیں اُن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خالق اور مالک کے ساتھ نہایت گہرا تعلق استوار کریں۔ جتنا یہ تعلق مضبوط اور مستحکم ہوگا اسی نسبت سے وہ اپنے حقیقی مقصد یعنی اللہ کی رضاجوئی میں کامیاب اور آخرت میں کامران ہوں گے۔ اور جتنا یہ تعلق کمزور ہوگا اسی تناسب سے انہیں دنیا اور آخرت میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ خواہ وہ اہلِ دنیا کی نظر میں اپنے آپ کو کتنا ہی کامیاب و کامران ثابت کر دیں۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا	اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا
لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا	اور اس "قرآن مجید" میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔ تاکہ
شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا	رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔ پس نماز
الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۔ (الحج: ۷۸)	قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔

خدا سے سچا تعلقِ خاطر پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان فکر و نظر، عقیدہ و عمل، اخلاق و کردار اور سلوک و معاملات غرض پوری زندگی میں اس قانون کی نہ صرف بالادستی تسلیم کرے۔ بلکہ اس کی مکمل پیروی بھی کرے۔ جو شخص اپنی ذات اور اپنی زندگی کے اس محدود سے دائرے میں جس میں اسے دینِ حق کے نفاذ کا پورا پورا اختیار ہوتا ہے اسے نافذ کرنے سے گریز کرتا ہے، تو اس سے آخر اس بات کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پوری قوم اور سارے ملک پر بلکہ پوری انسانیت اور سارے کرۂ ارض پر اسے سربلند کرنے کے لیے جدوجہد کرے گا، بالفرض اگر وہ کسی وقتی جذبے کے زیرِ اثر اس راہ پر گامزن بھی ہو جائے تو جلد ہمت ہار دے گا کیونکہ دینِ حق کی دعوت کا کام اور اس کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کوئی ایسی کاوش نہیں جسے کوئی فرد محض ازدحامی نفسیات کے طلسم میں گرفتار ہو کر کر سکے۔ اس کے لیے مقصد کا واضح شعور، اس کے ساتھ بے پناہ محبت، راستے کی مشکلات کے پورے احساس کے باوجود اس مقدس کام کو آگے بڑھانے کا عزمِ صمیم یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے داعیات اور جذبات و احساسات اس دعوت کو پھیلانے کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جذبات و احساسات اسی صورت میں زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں جب انہیں اپنی قوت کے اظہار کے لیے اجتماعی فضا میسر آتی ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی جڑیں اجتماعی ماحول میں نہیں بلکہ ایک فرد کے قلب و دماغ میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور وہیں سے انہیں غذا کا بیشتر حصہ فراہم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ تحریک کے ہر کارکن کا دل محبتِ الٰہی سے معمور ہو اور وہ ہمیشہ اس بات کا فکرمند رہے کہ ذاتِ برحق کی محبت دنیا کی ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب رہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (التوبہ : ۲۴)	اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں

کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

دوسری صفت جو تحریک کے ہر کارکن کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے وہ خاموشی سے کام کرنے کی عادت ہے۔ ملک میں سیاسی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ایک ایسی فضا قائم ہو گئی ہے کہ جس میں نمائشی کاموں کی اہمیت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔ اِس مسموم فضا کے زہریلے اثرات سے ہمیں اپنے آپ کو پوری طرح بچانے کی فکر کرنی چاہیئے اور یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نیتوں کو دیکھتا ہے اور ان کے مطابق انسان کے اعمال کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ خدا کی نظر میں خلوصِ نیت کے ساتھ معمولی کام کرنے والا زیادہ پسندیدہ ہو اور بڑے بڑے معرکے سر کرنے والا خاسر و خائب۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی کے ساتھ نیکی اور بھلائی کے کام کرنے والوں کی تعریف فرمائی ہے۔ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک قابلِ رشک کون شخص ہے تو آپ نے فرمایا:

اَغْبَطُ اَوْلِیَائِی عِنْدِی لَمُؤْمِنٌ خَفِیفُ الحَاذِ ذُو حَظٍّ مِنَ الصَّلٰوۃِ اَحْسَنَ عِبَادَۃَ رَبِّہٖ وَاَطَاعَہٗ فِی السِّرِّ وَکَانَ غَامِضًا فِی النَّاسِ لَا یُشَارُ بِالْاَصَابِعِ وَکَانَ رِزْقُہٗ کَفَافًا فَصَبَرَ عَلٰی ذٰلِکَ ثُمَّ نَقَدَ بِیَدِہٖ فَقَالَ عُجِّلَتْ مَنِیَّتُہٗ قَلَّتْ بَوَاکِیْہِ قَلَّ تُرَاثُہٗ۔

(مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

میرے نزدیک میرے احباب میں قابلِ رشک وہ بندہ مومن ہے۔ جو قلیل المال ہو، نماز سے بہرہ وافر رکھتا ہو۔ اپنے پروردگار کی عبادت نہایت حسن و خوبی سے کرتا ہو۔ اپنی زندگی کے مخفی معاملات میں اللہ ہی کی اطاعت کرتا ہو۔ اور گمنام سا ہو۔ اس کی طرف انگلیوں سے اشارے نہ کیے جاتے ہوں۔ رزق اس کے پاس بس اتنا ہو جس سے ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اور وہ اس پر صبر اور قناعت کرے۔ پھر آپ نے چٹکی بجائی اور فرمایا کہ موت بھی اسے جلدی آجائے اسے رونے والے بھی کم ہوں۔ اور اس کا ترکہ بھی کم ہو۔

قریب قریب اسی مفہوم کی ایک حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی یوں درج ہے۔

عن سھل بن سعد قال مَرَّ رجلٌ علی

سہل بن سعد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لرجل عندہ جالس ما رایک فی ھذا ۔ فقال رجل من اشراف الناس ھذا واللہ حریٌّ ان خطب ان ینکح وان شفع ان یشفع قال فسکت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم مرّ رجلٌ فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما رایک فی ھذا فقال یا رسول اللہ ھذا رجل من فقراء المسلمین ھذا حری ان خطب ان لا ینکح وان شفع ان لا یشفع وان قال ان لا یسمع لقولہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذا خیر من ملأ الارض مثل ھذا ۔

(صحیح بخاری ومسلم)

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ آپ نے پاس بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے کہا۔ اس شخص (گزرنے والے) کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ شخص شرفاء میں سے ہے۔ واللہ اس قابل ہے کہ اگر پیغام نکاح بھیجے تو اس کے ساتھ نکاح کر دیا جائے۔ اور اگر کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے۔ راوی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ جواب سن کر خاموش رہے۔ بعد ازاں ایک اور آدمی گزرا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ اس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا یا رسول اللہ یہ شخص تو غریب مسلمانوں میں سے ہے اس کی حیثیت یہ ہے کہ اگر یہ کسی کو پیغام نکاح بھیجے تو اس کے ساتھ نکاح نہ کیا جائے۔ اگر کسی کی سفارش کرے تو اسے قبول نہ کیا جائے۔ اور اگر کوئی بات کرے تو اس کی بات کو توجہ سے سنا نہ جائے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ موخر الذکر شخص بہتر ہے اُن اول الذکر تمام شرفاء سے جو چاہے اتنی بڑی تعداد میں ہوں کہ اُن سے روئے زمین بھر جائے۔

ہماری اِن گذارشات کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ بندۂ مومن کو نمایاں کام کرنے سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیئے اور اس بات کا التزام کرنا چاہیئے کہ اس کی زندگی بالکل گمنامی میں بسر ہو، بلکہ ہمارے کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بندۂ مومن کو زندگی کے ہر شعبے میں اور ہر مرتبہ اور مقام پر جو جماعت اور معاشرے میں اسے حاصل ہے۔ صرف خدا کی (باقی بر صفحہ ۴۵ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان

(۲)

کیا قربانی حضرت اسحاق کی دی گئی تھی یا حضرت اسماعیل کی؟ جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں، بنی اسرائیل کی یہ عادت رہی ہے کہ ہر قابل فخر بات کو وہ اپنی نسل کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور دوسری نسلوں کے لیے ان کے ہاں یا تو جھوٹے الزامات ہیں، یا پھر کم از کم یہ کہ جو فخر اُن کو حاصل ہوا ہو اسے بھی چھین کر اپنے حساب میں لکھ لیں۔ اسی عادت کے مطابق بیٹے کی قربانی کے اِس واقعہ کو بھی انہوں نے حضرت اسماعیل کے بجائے حضرت اسحاق کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بائیبل کا بیان ہے:

"خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابرہام ..... تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اِکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا" (پیدائش باب ۲۲۔ فقرات ۱-۲)۔

اِس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ اسحٰق کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اِکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائیبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحٰق اکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائیبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں:

"اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور ساری نے ابرام سے کہا "کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے۔ سو تو میری لونڈی کے پاس جا۔ شاید اُس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے ہوئے دس برس ہو گئے تھے جب اُس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی" (پیدائش ۱۶: ۱-۳)

"خدا کے فرشتے نے اُس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہو گا۔ اس کا نام اسماعیل

رکھنا" (پیدائش ۱۶: ۱۱)

"جب ابرام سے ہاجرہ کو اسماعیلؑ پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی[۸۶] برس کا تھا" (پیدائش ۱۶:۱۶)

"اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ سارہ جو تیری بیوی ہے ...... اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا ...... تو اس کا نام اضحاق رکھنا ...... جو اگلے سال اِسی وقت معین پہ سارہ سے پیدا ہوگا ..... تب ابرام نے اپنے بیٹے اسماعیل اور گھر کے سب مردوں کو لیا۔ اور اُسی روز خدا کے حکم کے مطابق اُن کا ختنہ کیا۔ ابرام ننانوے برس کا تھا۔ جب اُس کا ختنہ ہوا۔ اور جب اسماعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا" (پیدائش ۱۷: ۱۵-۲۵)۔

"اور جب اس کا بیٹا اضحاق اُس سے پیدا ہوا تو ابرام سو برس کا تھا" (پیدائش ۲۱: ۵)

اِس سے بائیبل کی تضاد بیانی صاف کُھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاقؑ کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تھی۔ کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاق کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں تو اُن میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔

مفسرین نے صحابہؓ و تابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے، اور اِس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ قتادہ۔ عکرمہ۔ حسن بصری۔ سعید بن جبیر۔ مجاہد۔ شعبی۔ مسروق۔ مکحول۔ زہری۔ عطاء۔ مقاتل۔ سدی۔ کعب احبار۔ زید بن اسلم وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیل تھے، اور اس گروہ میں حسب ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ حضرت معاویہؓ۔ عکرمہ۔ مجاہد۔ یوسف بن مہران۔ حسن بصری۔ محمد بن کعب القرظی۔ شعبی۔ سعید بن المسیب۔ ضحاک۔ محمد بن علی بن حسین (امام محمد الباقر)۔ ربیع بن انس۔ احمد بن حنبل وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام اِن میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ

سے دو مختلف قول منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے عکرمہ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاق تھے۔ مگر اُنہی سے عطاء بن ابی رباح یہ بات نقل کرتے ہیں کہ "یہودیوں کا دعوٰی ہے کہ وہ اسحاق تھے۔ مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں"۔ اسی طرح حضرت حسن بصری سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عمرو بن عُبید کہتے ہیں کہ حسن بصری کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اِس اختلافِ روایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماءِ اسلام میں سے بعض پورے جزم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحاقؑ کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ مثلاً ابنِ جریر اور قاضی عیاض۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی تھے۔ مثلاً ابنِ کثیر۔ اور بعض مذبذب ہیں۔ مثلاً جلال الدین سُیُوطی۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شُبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کی دُعا کی تھی، اور اُس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک حلیم (بُردبار) لڑکے کی بشارت دی تھی۔ فحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دُعا اس وقت کی گئی تھی جب آپؑ بے اولاد تھے اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی تھی وہ آپ کا پہلوٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی اِسی سورہ کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہوا تو اُسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹے صاحبزادے حضرت اسماعیل تھے نہ کہ حضرتِ اسحاقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ	شکر ہے اس خدا کا جس نے بڑھاپے میں مجھ کو
اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ط (ابراہیم-۳۹)	اسماعیل اور اسحاق عطا کیے۔

(۲) قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی گئی ہے وہاں اُن کے لیے غلام عَلیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ ہیں (الذاریات آیت-۲۸)، اور لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِیْمٍ (الحِجر-۵۳)۔ مگر سورۂ صافات میں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اُس کے لیے غلام حلیم (بُردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی نمایاں صفات الگ الگ تھیں اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں

بلکہ غلام حلیم کے لیے تھا کیونکہ بیٹے کی قربانی کا واقعہ اُسی بچے کے پیدا ہونے اور جوانی کے قریب پہنچنے کے بعد کیا گیا ہے اور دوسرے بچے کی پیدائش کی بشارت اس کے بعد دی گئی ہے۔

(۳) قرآن مجید میں حضرت اسحٰق کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ اُن کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ (ہود۔ ۷۱)۔ اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اُس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا اُس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اُسے ذبح کر رہے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اِس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے، کیونکہ اسے قربان کر دینے کے بعد اُس کے ہاں بیٹے (یعنی حضرت یعقوبؑ) کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحٰقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں لیکن درحقیقت یہ اِس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ اِن الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اُس کے سامنے آٹھ دس یا حد سے حد ۱۲۔۱۳ برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان اور صاحبِ اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

(۴) اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے "کہ ہم نے اُسے اسحاق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے"۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی، پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اُسے ذبح کرنے کا حکم ہوا، پھر جب حضرت ابراہیمؑ اِس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اور بیٹے اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیبِ واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحٰقؑ نہ تھے بلکہ وہ اُن سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے حضرتِ اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اِس شکل میں دیا گیا کہ اُن کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی

تو اللہ تعالیٰ اس سلسلۂ کلام میں یوں نہ فرماتا "کہ ہم نے اُسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے"، بلکہ یوں فرماتا کہ "ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے"۔

(۵) معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اُس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہؓ بن زبیر کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابنِ زبیر کا محاصرہ کیا اور خانہ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابن عباس اور عامر شعبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے خود خانہ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر)۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اِسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے تعمیر کردہ خانہ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

(۶) یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف روایت ہی نہیں تھی بلکہ اُس وقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آ رہا تھا کہ اُسی مقامِ منیٰ میں جا کر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے بھی اُس طریقے کو جاری رکھا، حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار سال کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اِس قربانی کے وارث بنی اسماعیل ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاق۔ حضرت اسحاقؑ کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اُسے حضرتِ ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود امتِ مسلمہ میں حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا؟ یہودیوں نے اگر حضرتِ اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرتِ اسحاقؑ کی طرف اِسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہِ کثیر نے اُن کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اِس سوال کا بہت شافی جواب علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں)، کعبِ احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب

حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مندرجات اُن کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ اُنہیں سُن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور رطب و یابس جو وہ بیان کیا کرتے تھے اُنہیں روایت کرنے لگے۔ حالانکہ اِس اُمّت کو اُن کے اِس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔"

اِس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے یا حضرت اسماعیلؑ؟ اُس وقت ایک صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا "امیرالمومنین! خدا کی قسم وہ اسماعیل ہی تھے، اور یہودی اِس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بِنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرتِ اسحاقؑ تھے"۔ (ابن جریر)

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈا تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں، اس لیے اُن میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو، جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالہ سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصب کارفرما ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّٰفّٰت، حاشیہ ۶۷)

بناءِ کعبہ پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ زمزم کی برکت سے قبیلۂ جُرہُم کے مختلف خاندان آ کر حضرت ہاجرہ واسماعیلؑ کے پاس بس گئے تھے اور مکہ ایک شہر بنتا جا رہا تھا۔ یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت ہاجرہ کی ملنساری کی وجہ سے اِن نو آبادکاروں کے ساتھ دونوں ماں بیٹوں کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ انہی کے درمیان پلے بڑھے تھے اور جب وہ جوان ہوئے تو اُن کے بہترین اخلاق اور عمدہ اوصاف کی وجہ سے جُرہمیوں کی خود یہ خواہش تھی کہ اُن کی شادی اُنہی کے ہاں ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ پہلے ایک لڑکی سے اُن کی شادی ہوئی، مگر حضرت ابراہیم کو وہ بہو پسند نہ آئی اس لیے حضرت اسماعیلؑ نے اسے چھوڑ کر دوسری لڑکی سے شادی کی جسے حضرت ابراہیمؑ نے پسند فرمایا اور اسی سے ان کے ہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ حضرت ہاجرہ کا انتقال بخاری کی اس روایت کے مطابق اپنے بیٹے کی پہلی شادی کے بعد ہی ہو چکا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اُس اصل کام کے لیے مکہ تشریف لائے جس کی خاطر انہوں نے تیس[۳] برس پہلے اپنی ذُرّیت کے اِس حصے کو اس بے آب و گیاہ وادی میں لا کر بسایا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی جس روایت کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے اس میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ایک روز زمزم کے پاس درخت کے نیچے حضرت اسماعیلؑ بیٹھے اپنے تیر بنا رہے تھے کہ یکایک حضرت ابراہیمؑ وہاں پہنچے۔ حضرت اسماعیلؑ انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور دونوں باپ بیٹے اُسی طرح ملے جس طرح بیٹے اپنے باپوں سے اور باپ اپنے بیٹوں سے ملا کرتے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اسماعیلؑ، اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے رب نے جس کام کا حکم دیا ہے آپ اسے ضرور کریں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں، میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے وادی کے اُس حصہ کی طرف اشارہ کیا جو اپنے گرد و پیش کی زمین سے کچھ اُٹھا ہوا تھا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہاں ایک گھر بنانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھائیں۔ حضرت اسماعیلؑ پتھر لاتے اور حضرت ابراہیمؑ ان کو نصب کرتے جاتے تھے۔ جب دیواریں کافی بلند ہو گئیں تو حضرت ابراہیمؑ وہ پتھر اٹھا لائے جو مقام ابراہیمؑ کے نام سے مشہور ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر پتھر نصب کرنے شروع کر دیے اور دیواروں کو مزید بلند کر دیا۔ (اضافہ از مؤلف)

عرب اور پوری دنیا میں کعبہ کی حیثیت یہ عمارت محض ایک عبادت گاہ ہی نہ تھی، جیسے مسجدیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ اوّل روز ہی سے اس کو دینِ اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکزِ تبلیغ و اشاعت قرار دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ایک خدا کو ماننے والے ہر جگہ سے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع ہوا کریں، مل کر خدا کی عبادت کریں، اور اسلام کا پیغام لے کر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ یہی اجتماع تھا جس کا نام "حج" رکھا گیا۔ اس کی پوری تفصیل کہ یہ مرکز کس طرح تعمیر ہوا، کن جذبات اور کن دُعاؤں کے ساتھ دونوں باپ بیٹوں نے اس عمارت کی دیواریں اٹھائیں، اور کیسے حج کی ابتدا ہوئی، قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ	یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی
بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ فِيْهِ	تھا جو مکہ میں تعمیر ہوا[۱۵]۔ برکت والا گھر اور سارے

[۱۵] واضح رہے کہ بیت المقدس خانہ کعبہ کے ایک ہزار برس بعد حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا، اس لیے کعبہ ہی وہ مرکزِ توحید ہے جو دنیا میں سب سے پہلے تعمیر کیا گیا (مولف)

آيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ

(آل عمران ۹۶-۹۷)

جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت۔ اس میں اللہ کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ مقام ابراہیم ہے۔ اور جو کوئی اس میں داخل ہو جاتا ہے، اس کو امن مل جاتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ

(العنکبوت ۶۷)

کیا لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کیسا پُرامن حرم بنایا ہے۔ حالانکہ اس کے گردوپیش لوگ اُچک لیے جاتے ہیں۔

یعنی جب کہ عرب میں دو ہزار برس تک ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت گری اور جنگ و جدل کا بازار گرم رہا، اس حرم میں ہمیشہ امن ہی رہا، حتیٰ کہ وحشی بدو تک اس کے حدود میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ پاتے تو اس پہ ہاتھ ڈالنے کی جراُت نہ کرتے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ . . . وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز، مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے مقامِ عبادت کو جائے نماز بنالو، اور ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو ہدایت کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو، اور جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ پروردگار، اس جگہ کو ایک پُرامن شہر بنادے اور یہاں کے باشندوں کو پھلوں کا رزق بہم پہنچا، جو بھی اُن میں سے اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والا ہو ...... اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس گھر کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار، ہماری اس کوشش

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔

(البقرہ - ۱۲۵ - ۱۲۹)

کو قبول فرما، تُو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے پروردگار اور تو ہم دونوں کو اپنا مُسلم (اطاعت گزار) بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اُٹھا جو تیری مُسلم ہو، اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر عنایت کی نظر رکھ کہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ پروردگار، اور تو ان لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول بھیجو جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق درست کرے، یقیناً تو بڑی قوت والا ہے اور بڑا حکیم ہے۔"

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۔

(ابراہیم - ۳۵ - ۳۷)

اور جب کہ ابراہیمؑ نے دُعا کی کہ پروردگار! اس شہر کو پُرامن شہر بنا دے اور مجھ کو اور میرے بچوں کو بُت پرستی سے بچا۔ پروردگار، ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ سو جو کوئی میرے طریقے کی پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرے طریقے سے پھر جائے تو یقیناً تو غفور اور رحیم ہے۔ پروردگار، میں نے اپنی نسل کے ایک حصہ کو تیرے اِس عزت والے گھر کے پاس اس بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ اے پروردگار یہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں میں ایسا شوق ڈال کہ وہ ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آئیں اور ان کو پھلوں سے رزق پہنچا۔ امید ہے کہ یہ شکر گزار بنیں گے۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْقَآئِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۔ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۚ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيرَ ۔

(الحج - ۲۶ - ۲۸)

اور جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر کی جگہ مقرر کی اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی کو میرے ساتھ شریک نہ کرنا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا اور (حکم دیا کہ) لوگوں میں حج کی عام منادی کر دو کہ تمہارے پاس آئیں، خواہ پیدل آئیں یا ہر دور دراز مقام سے دبلی اونٹنیوں پر آئیں تاکہ یہاں آ کر دیکھیں کہ ان کے لیے کیسے کیسے (دینی و دنیوی) منافع ہیں اور ان چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر جو اللہ نے ان کو دیے ہوں، اللہ کا نام لیں (یعنی قربانی کریں) اور اس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگدست و محتاج لوگوں کو بھی کھلائیں"
(خطبات صفحہ ۲۶۵ تا ۲۶۷)۔

عہد جاہلیت میں کعبہ کی برکات عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہو جاتا تھا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں[1] کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا

[1] حرام مہینوں سے مراد ہیں رجب عمرے کے لیے، اور ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم (باقی صفحہ آئندہ)

جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے قلادوں کی موجودگی سے اس نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں، اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تفہیم القرآن جلد اوّل۔ المائدہ حاشیہ ۱۱۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) حج کے لیے۔ ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں۔ اور حج و عمرہ کے لیے جانے والوں کو راستے میں کوئی نہ چھیڑ سکتا تھا۔ (مولف)

قوموں کا عروج و زوال قرآن کے آئینے میں

(از طیب شاہین لودھی صاحب)

(۳)

بنی اسرائیل کا عروج و زوال بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے اتنے احسان کیے ہیں کہ شاید ہی کسی اور قوم کو اللہ کے انعامات و اکرامات کا اتنا وافر حصہ ملا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ	اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمت کو جو میں
اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي	نے تم کو عطا کی اور تمہیں میں نے تمام دنیا والوں
الْعٰلَمِيْنَ۔ (البقرہ۔ ۴۷)	پر فضیلت بخشی۔

جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو کنعان کے بیابانوں سے اٹھا کر مصر کے سبزہ زاروں میں پہنچایا تو دراصل یہ قبطیوں کی اصلاح کے لیے بنی اسرائیل کو ایک موقع بہم پہنچایا تھا۔ مگر یہ فریضۂ اقامتِ دین سے غافل رہے اور وہاں کے قبطیوں کو دین سے کماحقہ روشناس نہ کرا سکے اور قومی برتری کے جھوٹے اور جاہلانہ احساس میں مبتلا ہو گئے۔ آخر مصریوں میں قوم پرستی کی لہر آئی۔ اسرائیلیوں کو اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اسرائیلی تہذیب کو مٹانے اور اسرائیلی قوم کو دنیا سے نابود کرنے کی سازشیں ہونے لگیں۔ اُن کی نسل کشی کے لیے اُن کے نوزائیدہ بچوں کو ایک قانون کے تحت قتل کیا جانے لگا اور لڑکیوں کو قبطیوں کی خدمت کے لیے باقی رکھا جانے لگا۔

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ	وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور
نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ	تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور
مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۔	اس بات میں تمہارے لیے تمہارے رب کی طرف
(البقرہ۔ ۴۹)	سے سخت آزمائش تھی۔

اُن سے زبردستی بیگار لی جاتی۔ اُن کو برسرِ عام رسوا کیا جاتا۔ حتّٰی کہ قتل تک کر دیا جاتا۔ یہ مجبور قوم

ذلت ونکبت کے دن گزار رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ گویا یہ قوم رسوائی اور غلامی کی زندگی پہ قانع ہو چکی ہے اور ذلت اُن کا مقدر بن چکی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعاؤں کو سُنا اور اُن کی ہدایت اور راہبری کے لیے حضرت موسیٰ کو مبعوث کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسلسل جد وجہد کے ذریعہ حالات کو سدھارنے کی کوشش کی مگر فرعون کو ان اصلاحی کوششوں کے پیچھے اپنے اقتدار کا سنگھاسن ڈگمگاتا ہوا نظر آنے لگا اور وہ ان اصلاحی کوششوں کو ناکام کرنے پر تل گیا۔ آخر کار اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائیں۔

بنی اسرائیل کی پوری تاریخ ہی دین سے دوری، نافرمانی اور سرکشی سے لبریز ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پوری قوم نے دیکھ لیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو فرعون کے ظلم واستحصال سے نجات دی اور پھر اُن ظالموں کو اُن کے آنکھوں دیکھتے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ پھر سینا کے صحرا میں اُن کو بھوک پیاس اور دھوپ سے محفوظ رکھا۔ مگر یہ قوم کہ غلامانہ ذہنیت ہی جس کی سرشت بن چکی تھی مصریوں کے عقائد سے بُری طرح متاثر ہو چکی تھی اور مصریوں کے مشرکانہ تمدن میں رنگی جا چکی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چند دن کی غیر حاضری کے دوران شرک جیسی قبیح برائی میں مبتلا ہو گئی۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ۔

(الاعراف - ۱۴۸)

موسیٰ کے پیچھے اس کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کا پتلا بنایا جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی۔ کیا اُن کو نظر نہ آیا کہ وہ نہ اُن سے بولتا ہے اور نہ کسی معاملہ میں اُن کی راہنمائی کرتا ہے۔ مگر پھر بھی انہوں نے اسے معبود بنا لیا اور وہ سخت ظالم تھے۔

پوری قوم کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کے سوا کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو قوم کو اُس کی اِس غلط روش پر نکیر کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے واپس آکر قوم کو اللہ تعالیٰ کے عطا فرمودہ اسلامی ضابطہ حیات سے روشناس کیا، اور اسے اختیار کرنے کی تلقین کی۔

وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا بِأَحْسَنِهَا ۚ سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ۔ (الاعراف - ۱۴۵)

اور ہم نے موسیٰؑ کو ہر شعبہ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دے دی اور اس سے کہا کہ ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔ عنقریب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔

مگر یہ قوم فقہی موشگافیوں میں پڑ گئی اور مختلف حیلوں سے احکام الٰہی کو پس پشت ڈالتی رہی۔ بنی اسرائیل سے وعدہ کیا گیا تھا کہ خطۂ فلسطین میں اسے آباد کیا جائے گا تاکہ وہ وہاں ایک اسلامی ریاست قائم کر کے دنیا کی گمراہی کی گھمبیر تاریکیوں میں ہدایت کی مشعل روشن کرے۔ مگر یہ لوگ جہاد سے جی چرانے لگے۔ آخر اس بدبخت قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہاں تک کہہ دیا۔

فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ۔ (المائدہ - ۲۴)

تم اور تمہارا رب ہی جا کر دشمنوں سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

اُن کے جہاد سے جی چرانے پر اللہ تعالیٰ نے ارض مقدس اس نسل پر حرام کر دی اور وہ نسل جو اُس وقت موجود تھی اس کا ایک فرد بھی (حضرت موسیٰؑ کے دو مخلص صحابیوں کے سوا) فلسطین میں داخل نہ ہو سکا۔ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے کئی برس بعد ارض فلسطین فتح ہوئی۔ وہ بھی شاید نئی نسل کی اسلامی تربیت کے بعد۔ مگر اس قوم کی سرشت میں نافرمانی گویا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اِن لوگوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اللہ کی آیات کی غلط اور من مانی تاویلیں کر کے کتاب اللہ کو اپنی خواہشات نفس کے تابع بنا لیا۔ مشرک قوموں کے اثرات قبول کر کے شرک و جاہلیت کے ہر فتنے میں مبتلا ہوئی۔ شریعت الٰہی کے احکام کو مسخ کیا اور دین کی روح کو یکسر ختم کر دیا۔ اُن کی اصلاح اور اقامت دین کے لیے انبیاء کرام اور مصلحین اٹھے تو اُن کو جھٹلایا اور اُن کی ایذا رسانی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی حتیٰ کہ بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو پھانسی پر چڑھایا۔

فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ۔ (المائدہ - ۷۰)

انہوں نے (نبیوں کے) ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کیا۔

اللہ تعالیٰ نے سبت کے دن کو اُن کے لیے فراغت کا دن بنایا تھا مگر اس دن میں انہوں نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـــِٕيْنَ (البقرہ۔ ۶۵)

اور تمہیں اُن کا معاملہ تو معلوم ہے جنہوں نے سبت کے روز زیادتی کی تھی تو ہم نے اُن سے کہا تم دھتکارے ہوئے بندر ہو جاؤ۔

سرزمین فلسطین میں وہ کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکے۔ جتنے قبیلے تھے اتنی ہی ریاستیں وجود میں آگئیں اور ہر ریاست اقامت دین سے غافل تھی۔ فلسطین اور شام کی اصل قوموں حتّیوں، اموریوں، کنعانیوں، فرزیوں وغیرہ قوموں میں بدترین قسم کا شرک اور اس پر مبنی انتہائی ظالم اور گندہ معاشرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم موجود تھا کہ مشرک اور ظالم قوموں کو جہاد اور تبلیغ سے ختم کر کے فلسطین میں اسلامی ریاست قائم کی جائے۔ مگر بنی اسرائیل کی جہاد سے غفلت اور تن آسانی کی وجہ سے نہ تو ان قوموں کا قلع قمع ہوسکا اور نہ کوئی متحدہ اسلامی ریاست قائم ہو سکی۔ اس انتشار کی وجہ سے وہ شرک اور بدعملی کی اُن تمام آلائشوں میں ملوث ہو گئے جن میں پہلی قومیں لتھڑی ہوئی تھیں۔ اُن مشرک قوموں کی اعتقادی گمراہیوں اور عملی برائیوں سے بچنے کی انہیں خاص تلقین کی گئی تھی مگر یہ اُن قوموں کے مشرکانہ اعتقادات اور اُن کی تہذیب کو اپنائے بغیر نہ رہ سکے۔ اسرائیلیوں نے انہی تاریک اور تباہ کن راستوں کو اختیار کر لیا جن سے دنیا کو بچانے کے لیے انہوں نے اپنے خدائے بزرگ و برتر سے عہد کیا تھا۔ مشرک قوموں سے اختلاط کی وجہ سے اپنے قومی تشخص، اپنے تمدّن کی انفرادیت، اپنے مبنی بر وحی اعتقادات اور اپنے نظریۂ حیات کی حفاظت میں وہ ناکام رہے۔ جہاد سے جی چرانے لگے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ تک وہ پوری طرح مشرک قوموں کے تہذیب و تمدن میں رنگے جا چکے تھے۔ مگر شاید ابھی اُن کی مکمل رسوائی اور ذلت مطلوب نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اور مہلت دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے اُن کی اصلاح کی کوشش کی۔ ان کے اعتقادات کی تطہیر کی اور ان کے اندر جہاد کی روح پھونکی اور وہ تباہی کی طرف کشاں کشاں رواں دواں قوم کو ایک بار سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد اسرائیلیوں میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ بنی اسرائیل پھر دو ریاستوں میں تقسیم ہو گئے اور بدعملی کی آلائشوں میں گردن تک دھنس گئے۔ آخر اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انہیں آلیا۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ـ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ؕ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ـ

(بنی اسرائیل - ۴-۵)

اور ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس فیصلے سے خبردار اور متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے - آخر کار جب پہلی سرکشی کا موقع آیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے - وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے - یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا -

اور اللہ تعالیٰ کی یہ وعید اس طرح پوری ہوئی کہ پہلے آشوریوں نے اسرائیل کی ریاست سامریہ کو تاخت و تاراج کیا - وہاں کے اسرائیلیوں کو شام اور دوسرے ملکوں میں تتر بتر کر دیا - اُن کی تہذیب کو ملیا میٹ کیا - اُن کی نسل کشی کی - پھر کچھ عرصہ بعد اہل بابل نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی - ہیکل سلیمانی کو مسمار کر دیا - تمام معابد کو منہدم کر دیا - تورات کے تمام نسخے جلا دیے - قتل عام کیا گیا - عورتوں کی عصمت دری کی گئی - اس عذاب سے انہیں کہیں پناہ نہ ملی - چاروں طرف سہمے ہوئے بچے - تھے جن کو غلام بنا لیا گیا تھا - دم توڑتی ہوئی عصمتوں کی چیخ پکار تھی اور نافرمان جوانوں کی بے بسی تھی - اُن کے عالم اور ربّی اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر دعائیں کر رہے تھے - مگر دعا کی قبولیت کا وقت تو جا چکا تھا - مہلت ختم ہو چکی تھی - تباہی کے کھڈ میں لڑھکتی ہوئی قوم کو بے وقت دعائیں کیسے بچا سکتی ہیں —— بچے کھچے اسرائیلیوں کو اہل بابل ریوڑوں کی طرح ہانک کر بابل لے گئے جہاں کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر تھی - وہ موت کے لیے پکارتے تھے مگر موت اُن سے دور بھاگتی تھی اور ذلت و رسوائی سامنے آتی تھی - یوں وہ سالہا سال تک اس ذلت ناک عذاب میں مبتلا رہے - اللہ کی کتاب سے محروم کر دیے گئے - اپنی تہذیب اور اپنی روایات سے بیگانہ ہو کر رہ گئے - ان کی قومی زبان عبرانی تک باقی نہ رہی -

آخر کار اُن میں اس زمانے کے نبی حضرت عزیر علیہ السلام پیدا ہوئے - انہوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا - انہوں نے توراۃ دوبارہ مرتب کی - ان کے اصلاحی اور تجدیدی کارناموں سے بنی اسرائیل میں

دینی روح بیدار ہوئی اور انہوں نے من حیث القوم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ تب اللہ تعالیٰ کی رحمت نے ایک بار پھر انہیں ڈھانپ لیا۔ ایرانی بادشاہ ذوالقرنین (سائرس یا خورس یا خسرو) نے بابل کی بت پرست سلطنت کا خاتمہ کر کے اسرائیل کو رہا کر دیا۔ اور اُن کو دوبارہ فلسطین میں ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ یوں ایک مرتبہ پھر بنی اسرائیل فلسطین میں اپنی آزاد ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ ایک مرتبہ پھر اسرائیلی اندرونی انتشار اور نفاق کا شکار ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی ان پر مسلط ہو گئے۔

یونانیوں نے اُن کی تہذیب کو بیخ و بن سے اکھاڑنا شروع کیا حتیٰ کہ بیت المقدس اور دیگر عبادتگاہوں میں بت رکھوا دیے۔ یونانیوں کے بعد رومیوں نے اُن کی جگہ لے لی۔ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے تک اس نافرمان قوم کی سرکشی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ انہوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکباز اور معصوم انسان کو شہید کر دیا۔ اُن کا اجتماعی ضمیر اس قدر مردہ ہو گیا تھا کہ اس نیک انسان کے قتل کے خلاف پوری اسرائیلی قوم میں ایک آواز بھی نہ اُٹھی۔ پھر حضرت مسیحؑ کو ستانے اور اُن کو ایذا پہنچانے کی حد کر دی۔ اُن کو نعوذ باللہ ولدالزنا کہا گیا۔ اُن کی تضحیک کی گئی۔ آخر کار اُن کو بغاوت کے جھوٹے الزام میں رومی کافرانہ عدالت کے حوالے کر دیا۔ تب حضرت مسیح علیہ السلام نے اُن کو اس دردناک عذاب کی خبر دے دی جو اس بدکردار اور مقہور قوم پر ٹوٹنے والا تھا۔

"اے یروشلم اے یروشلم! تو جو نبیوں کو قتل کرتا ہے جو تیرے پاس بھیجے گئے اور اُن کو سنگسار کرتا ہے۔ کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں مگر تو نے نہ چاہا۔ دیکھو تمہارا گھر تمہارے لیے ویران چھوڑا جاتا ہے۔" (متی باب $\frac{۲۳}{۳۷-۳۸}$)۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے۔" (متی $\frac{۲۴}{۲}$)۔

"اے یروشلم کی بیٹیوں میرے لیے نہ روؤ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ کیونکہ دیکھو وہ دن آتے ہیں جب کہیں گے کہ مبارک ہیں بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنے اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس دن وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور

ٹیلوں سے کہ ہمیں چھپالو" (لوقا باب ۲۳: ۲۸-۳۰)

اور قرآن کریم نے اس گزرنے ہوئے ذلت آمیز عذاب کی ان الفاظ میں خبر دی ہے۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ۔

(بنی اسرائیل - ۷)

پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آ یا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اُسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر اُن کا ہاتھ پڑے اُسے تباہ کر کے رکھ دیں۔

یہودیوں نے رومیوں کے خلاف بغاوت کی۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے بعد رومیوں نے لاکھوں یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ ہزاروں معصوم بچوں کو غلام بنا لیا اور لاکھوں خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں اپنے ساتھ لے گئے۔ ہزاروں آدمیوں کو جنگلی جانوروں سے پھڑوا دیا گیا اور بے شمار انسانوں کو جنگی وحشیانہ کیمپوں میں محصور کر دیا گیا ——— ہیکل سلیمانی کا کوئی پتھر ایسا نہ تھا جو اپنی جگہ چھوڑ گیا ہو ——— مقہور اسرائیلی قوم دنیا میں انتہائی ذلت کے ساتھ تتر بتر کر دی گئی اور فلسطین میں اس کا داخلہ تک بند کر دیا گیا۔

وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۔ (الاعراف ۱۶۸) - ہم نے اُن کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔

اور اس طرح دنیا کی ایک اور عظیم قوم اپنی بدکرداری اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اپنے عہد کو فراموش کر دینے کی بنا پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پستیوں میں لڑھکا دی گئی۔ قرآن کریم کی روشنی میں قوموں کے عروج و زوال کے اس سرسری مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جب کوئی قوم مادی خوشحالی، بلند معیار زندگی، اور ایک بڑھ آسائش حیات ہی کو اپنا مقصد زیست بنا لے، اور پھر اس کی خاطر اللہ تعالے کی نافرمانی، جبر و استحصال، ظلم و تعدی اور ناتوان، کمزور اور بے بس عوام کی حق تلفی کو اپنا شعار بنا لے، اللہ تعالیٰ سے اپنے کیے ہوئے عہد وفا کو پس پشت ڈال دے، رذیلوں کو اپنا حاکم اور شریفوں کو اپنے معاشرہ میں نکو بنا کر رکھ دے، تو اس کے بعد سنت الٰہی کے مطابق، عذاب خداوندی کا کوڑا اس پر برس کر رہتا ہے، اور ایسی قوم کی تباہی قضائے مُبرم بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمت بے پایاں کے تصدق میں ہم کو اس انجام بد سے محفوظ رکھے اور ہم گنا ہگاروں کے قلوب میں احساس زیاں بیدار کر کے ہمیں اپنی سچی اطاعت کی توفیق سے بہرہ یاب کر دے۔ آمین!

حدود اللہ کی حکمت، سامراجی دور میں ان کا خاتمہ اور اب ان کی ضرورت

(جناب حبیب ریحان صاحب ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ، البیضا، لیبیا)

اسلامی نظام اور قانون شریعت سارے اسلامی ممالک میں اپنی پوری دفعات کے ساتھ، عبادات و اجتماعیات و اخلاقیات سے لے کر قصاص و حدود تک سینکڑوں برس تک جاری رہا۔ پھر اس میں جزوی تبدیلی کی ابتدا سامراج کے زمانے میں سامراجی سازشوں اور مسیحی مشنری حکومتوں کے زیر سایہ ہوئی تھی، اور بد قسمتی سے سب سے پہلے قانونِ حدود ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں ختم ہوا تھا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بھی ۱۷۹۱ء تک قانونِ شریعت لاگو تھا اور مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد انگریزوں نے رفتہ رفتہ اور وقتاً فوقتاً وضعی قوانین نافذ کرنے شروع کیے اور انیسویں صدی کے وسط تک قانون شریعت ختم کر دیا گیا۔ مصر میں بھی سامراجی سازشوں سے ۱۸۸۳ء میں قانونی نظام، فرانسیسی قانون کے مطابق ڈھالا گیا۔ بیسویں صدی میں البانیا، اور ترکی نے پوری جرأت و بے باکی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ وہ لادینی حکومتیں ہیں اور [illegible] سے قوانین حتیٰ کہ پرسنل لا تک اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس کے قوانین کے ماتحت بنا دیے گئے۔[1]

مسلم پرسنل لا تبدیلی سے محفوظ رہا

سامراجی دور میں غیر ملکی حکام نے مسلمانوں کے عائلی قوانین کو ہاتھ نہیں لگایا تھا بلکہ وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق بنائے گئے تھے اور علمائے اسلام کے مشورے سے بنائے گئے تھے، اور

---

[1] مولانا مودودی کی عربی کتاب "نظریۃ الاسلام و ہدیہ" سے ماخوذ باختصار، حاشیہ صفحہ ۱۳۸ - ۱۳۹۔ یہ کتاب قانونِ اسلامی سے متعلق مولانا کے ۶ مقالات و لکچرز پر مشتمل ہے، دارالفکر بیروت و دمشق سے چھپی ہے۔

اسی طرح کسی جگہ بھی ان میں تغیر کرنے کی کوئی تحریک نہیں چلائی گئی تھی۔ ایسا نیا اور ٹرکی کے لیے شرم و عار کا مقام تھا کہ جو کام سامراجی اور غیر مسلم حکومتیں نہ کر سکیں دیدہ دلیری کے ساتھ وہ کام انہوں نے انجام دیا۔ ان کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں میں پرسنل لا کے احکام اسلامی شریعت کے مطابق آج تک نافذ ہیں، گو بعض اوقات ان میں جزوی تبدیلی کی ناکام کوششیں بعض نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں۔ بہرحال یہ ناکام کوششیں، یا کسی مقام پر کوئی جزوی تبدیلی بھی مسلم ممالک کے لیے شرم و عار کا سامان ہے کہ یہ وہ کام ہے جس کی جرأت سامراج بھی نہ کر سکا تھا۔ اس قسم کی ساری کوششیں غیر عقلی، غیر فطری، غیر آئینی اور غیر شرعی ہیں جو نہ خود صحیح ہو سکتی ہیں، نہ کسی دوسرے کے لیے حجت بن سکتی ہیں[۵]۔ اور ان کا انجام یہ ہے کہ وہ عنقریب ناکامی ہی کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔

عظیم سامراجی سازش اور اس کا مقصد جیسا کہ بیان کر چکا، اسلامی قانون (پرسنل لا کو چھوڑ کر) کا خاتمہ اسلامی ممالک میں مشنری اداروں اور حکومتوں کے زیر سایہ ہوا تھا، جب سامراجی ریشہ دوانیاں عروج پر تھیں۔ لیکن سیاسی طور پر، اور بین الاقوامی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب، اور فطرت کے قانونِ اقتدار و عروج و زوال کے پیش نظر جب مغربی حکمرانوں کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں ان کو اسلامی ملکوں سے واپس نہ جانا پڑے تو انہوں نے اپنے فکری سامراج کو تادیر باقی رکھنے کے قدیم منصوبہ میں از سر نو جان ڈال دی۔ وہ اسلام کی دوبارہ زندہ ہو کر پوری توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ساری دنیا پر پھر سے چھا جانے کی فطری صلاحیت کے خلاف زبردست بند باندھنا چاہتے تھے، اور "ایوان کسریٰ" سے زیادہ پرشکوہ پایۂ تخت اور "فصیل قسطنطنیہ" سے زیادہ مضبوط ڈیفنس پوزیشن بنانا چاہتے تھے۔

اس کے پیش نظر سامراجی حکمرانوں نے بڑی طویل اسکیم اور کاوش کے ذریعے انتہائی چابک دستی اور کونین میں شکر لپیٹنے والی پالیسی کے ساتھ اسلامی افکار کو بدلنے کا پلان بنایا۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصابِ تعلیم اور عدالتوں اور تمام زندگی کے شعبوں میں لادینی نظام کی سرپرستی کی۔ لیکن ساتھ ہی مشنری انداز کو بھی ہاتھ

---

[۵] یہ کیوں غیر قانونی ہیں اور کسی کے لیے بھی حجت نہیں بن سکتیں، اس کی تفصیل راقم نے ایک مضمون میں کی ہے جس کا عنوان ہے "مسلم پرسنل لا سے متعلق دو سوالوں کے جوابات" جو ان شاء اللہ عنقریب ہدیہ ناظرین کیا جائے گا۔

سے جانے نہیں دیا۔ یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور تھوڑی ہی مدت میں ایسے ہونہار اور فاضل سپوت پیدا ہو گئے جن کے نام ضرور اسلامی تھے لیکن انہوں نے اسلامی قانون اور نظام کے خلاف وہ کام سرانجام دیے جو غیر مسلم بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس سلسلے میں اسلامی عقائد میں تشکیک، مسلّم الثبوت نظریات میں اشتباہ، اسلام کے قانون فوجداری پر ظلم کا اعتراض، قانونِ حدود پر وحشیت اور بربریت کا الزام اور عائلی قوانین پر رجعیت کا فتویٰ وغیرہ جیسی تمام غیر علمی کوششیں علم اور ریسرچ کے نام پر شامل ہیں۔ ان ساری سامراجی کوششوں کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ لادینیت کا جذبہ نہ تھا بلکہ وہ صلیبیت تھی جس نے دوسرا رنگ اختیار کرنا چاہا تھا اور علمی روپ میں نمودار ہوئی تھی۔ یہودی و مسیحی اختلافات کے باوجود یہودیت اور صہیونیت نے بھی مسیحیت کے دوش بدوش اسلامی ریسرچ کے نام پر اسلامی تعلیمات کو غبار آلود بنانے کی ہر ممکن سعی کی۔ ان تمام مساعی کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان اپنے دین اور اقدار و افکار و عقائد و نظریات کے بارے میں مشکوک ہو جائیں اور اس طرح شاید وہ مسیحیت کے پنجہ میں گرفتار ہو جائیں۔ یہ خواہش کوئی نئی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے۔ حضور نامدار سے خطاب الٰہی یوں ہے:

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔
ہرگز تم سے راضی نہیں ہو سکتے یہود اور نصاریٰ یہاں تک کہ تم ان کی ملت کی پیروی کرو۔

اس کے جواب میں ذات باری تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہدایت تو صرف اسلام کے زیر سایہ ہے، اور رحمت الٰہی اور خدا کی بخشی ہوئی نبوت و عصمت کی وجہ سے اس کو چھوڑنا ناممکن ہے۔ لیکن فرض کرنے کہ رسول بھی اگر ہدایت الٰہی اور اسلام کی دولت سے معمور ہونے کے بعد یہود و نصاریٰ کی تحریفات و اہواء کا متبع ہو جائے تو دنیا میں بے یارو مددگار، اور آخرت میں نامراد ہو جائے گا۔ اس صورت میں اے اہل اسلام خوب کان کھول کر سن لو کہ سامراجی، صلیبی، مشنری، صیہونی، اور اسی طرح سے وہ جو شرک کی جاہلیت میں مبتلا ہیں، یعنی سورج پرست، ستارہ پرست، پتھر پرست، نیچر پرست، عقل پرست، اور اسی طرح وہ جو کسی چیز کی پرستش کو بھی صحیح نہیں مانتے غرض تمام طاغوتی اور باطل تنظیموں کی متحدہ خواہش اور متحدہ کوششیں یہی ہیں کہ اسلام کے چراغ کو گل کر دیا جائے وہ اپنے تمام آپس کے شدید اختلافات کو بھلا کر اسلامی عداوت کے اصول پر متحد ہو گئے ہیں۔ لیکن مسلمان کے لیے کسی صورت میں بھی ان خواہشاتِ باطلہ اور اہوائے طاغوتیہ کی پیروی کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کو اس کی ممانعت اور ساتھ ہی اَحقّیّتِ اسلام کا بیان اِسی آیت پاک میں دیا گیا ہے:

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۔ (بقرہ - ۱۲۰)	کہہ دو بیشک اللہ کی ہدایت وہ ہدایت کی راہ (اسلام) ہے، اور (فرض کرو کہ تم) اگر ان کی خواہشات کی پیروی کرو اس کے بعد جو تمہارے پاس علم (وحی اور اسلام) آچکا ہے، تو نہ ہو گا تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار۔

اس آیت کی مختصر تشریح یہاں اس آیت کی مختصر تشریح ضروری ہے، رسولِ خدا ساری انسانیت کو ہدایت خداوندی سے سرشار کرنا چاہتے تھے۔ آپ کا منصبِ تبلیغ و ختم نبوت و رسالت بھی اس کا مقتضی تھا۔ کفارِ قریش اور یہود و نصاریٰ سب کے لیے آپ کی عالمی دعوت و ہدایت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ یہود و نصاریٰ کا پندار یہ تھا کہ ہر گروہ اپنے آپ کو اللہ کا بیٹا اور محبوب کہتا تھا اور جنت کا اکیلا مستحق۔ اس کا جواب اللہ نے بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ (بقرہ - ۱۱۲) میں یہ دیا کہ جو اللہ کی کلی رضا کا تابع و طالب ہوا وہ جنت کا مستحق ہو گا۔ پھر حضور انورؐ اور آپؐ کی امت کو ایک خاص بات یہ بتانی مقصود ہے کہ ہدایت الٰہی اور حق کی تلاش کرنے والا یہود و نصاریٰ کا وہ گروہ جو اخلاص و صداقت کے ساتھ کتبِ الٰہیہ کا مطالعہ کرتا ہے وہ حضورؐ سے متعلق پیشینگوئیوں اور اسلام کی صداقت و حقانیت پر ایمان لے آتا ہے (بقرہ - ۱۲۱)۔ لیکن عامۃ الیہود و النصاریٰ کا شعار یہ ہے کہ وہ آپ کے دین میں داخل ہونے کے بجائے اُلٹے آپ کو اپنی اہواء یعنی یہودیت و نصرانیت کی محرّف اور بگڑی ہوئی شکل میں داخل کرنے کے درپے رہتے ہیں، اور جن اشیاء کو منسوخ کرنے آپ آئے تھے اُنہی کی طرف آپ کو بلانے لگتے ہیں، اور یہودیت و نصرانیت کیونکہ دو متضاد، مختلف اور محرّف دین ہیں، اس لیے دونوں گروہ اپنی اپنی خواہشات کی طرف بلاتے ہیں۔ لیکن آپ عقلاً بیک وقت یہودی اور نصرانی ہو ہی نہیں سکتے، اور اس لیے یہ دونوں گروہ آپ سے کسی طرح راضی نہیں ہو سکتے۔ رہا شرعاً، تو چونکہ آپؐ کو رحمت الٰہی رسالت و نبوت کی شکل میں، اور فضل الٰہی وحی اور قرآن کی شکل میں، اور نعمت الٰہی عصمت و طہارت کی شکل میں ملی ہوئی ہے، اس لیے آپ ان کی اہواء و خواہشات کی پیروی بھی نہیں کر سکتے۔

ھُدیٰ کا مطلب ھُدیٰ سے مراد اسلام تمام مفسرین کی رائے کے مطابق ہے۔ اور آیت کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے۔ یہود و نصاریٰ کی اہواء اور ملت کے مقابلے میں جس ہدایت الٰہی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جس حصر کے

ساتھ اور دوسرے الف لام کے ساتھ اسے بیان کیا گیا ہے اس سے واضح طور پر اسلام ہی مراد ہے کہ وہی کلی ہدایت کی راہ ہے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ جس کی طرف یہ لوگ آپ کو بلانے میں وہ ہدیٰ نہیں بلکہ ہوی کی راہ ہے۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (قصص۔ ۵۰)۔ صرف مفسر طبری نے ہدیٰ کا مفہوم اس طرح لکھا ہے

"بیشک اللہ کا بیان ہی فائع کرنے والا ہے، اور فیصلہ کن ہے ہمارے درمیان، پس آؤ اللہ کی کتاب اور اس کے بیان کی طرف، جس میں اس نے بندوں کے لیے مختلف فیہ چیزیں بیان کر دی ہیں، اور وہ توراۃ ہے جس کے تم سب مُقِر ہو کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، اس میں تمہارے لیے واضح ہو جائے گا کہ ہم میں سے حق پہ کون ہے اور باطل پہ کون، اور کون جنت والا ہے اور کون دوزخ والا، اور کون صحیح راہ پہ ہے اور کون غلطی پہ؟ اور بیشک اللہ نے اپنے نبیؐ کو یہ حکم دیا کہ ان کو ہدایت و بیان الٰہی کی طرف بلائیں، کیونکہ اس میں یہود و نصاریٰ کی تکذیب تھی اُس قول میں جو انہوں نے کہا تھا کہ یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے کا بیان تھا، اور یہ کہ اس کو جھٹلانے والا آگ کا مستحق ہے نہ کہ اس کی تصدیق کرنے والا"

طبری کا یہ قول اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ غیر محرّف اور منزّل من اللہ توراۃ ہدایات کی کتاب تھی، لیکن مذکورۂ بالا آیت کی تفسیر و تشریح کے اعتبار سے یہ قول مرجوح ہے۔ طبری کا یہ استدلال کہ یہود و نصاریٰ کے قول لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى کا یہاں جواب ہے قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ اس کا جواب خدائے پاک نے فوراً ہی اس آیت کے بعد اس طرح دے دیا تھا،

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (بقرہ۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲)۔

دوسری بات یہ کہ جس ہدایت الٰہی کا تذکرہ اس آیت میں ہے اس سے مراد وہ ہدایت ہے جو حضورؐ کو دی گئی تھی اور آپ کے پاس موجود تھی اور وہ قرآن و اسلام ہے، کیونکہ غیر محرّف توراۃ کا کوئی نسخہ حضورؐ کے پاس موجود نہ تھا بلکہ آپ کی شریعت ساری شریعتوں کی ناسخ بن کر آئی تھی۔

تیسری بات یہ کہ آیت کے آخر میں جس علم الٰہی کے حضورؐ کے پاس آجانے کا تذکرہ ہے اس سے مراد قرآن پاک، وحی اور اسلام ہی ہے۔ لیکن طبری کے قول سے بھی اہل اہوا کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ان پر مزید حجت قائم

ہوتی ہے اور یہ حجت قرآن نے بار بار دوسری آیات میں قائم کی ہے اور اہل کتاب کو توراۃ کی تحکیم کی دعوت دی ہے۔
تاہم آیت کے صاف اور راجح معنی وہی ہیں جو تمام مفسرین نے اختیار کیے ہیں۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں "خدا کی ہدایت جو اسلام ہے وہی اصل ہدایت ہے"۔

صاحب بحر المحیط ابن حیان اندلسی لکھتے ہیں "اللہ کی ہدایت، یعنی وہ ہدایت جس کی اضافت (نسبت) اللہ کی طرف ہے، وہ وہ اسلام ہے جس پر آپ ہیں، وہی اصل اور مکمل نفع پہنچانے والی ہدایت ہے جس کے علاوہ کوئی ہدایت نہیں"۔

مفسر رازی کا بیان ہے "بیشک اللہ کی ہدایت وہی ہے جو اسلام کی طرف ہدایت کرتی ہے اور وہی حقیقتاً وہ ہدایت ہے جس کو ہدایت کہا جا سکتا ہے"۔

ابوالسعود کہتے ہیں "بیشک خدا کی ہدایت جو اسلام ہے وہی حق ہے"۔

ابن کثیر کا قول ہے "کہہ دیں اے محمدؐ بیشک وہ اللہ کی ہدایت جو دے کر اس نے مجھے بھیجا ہے وہی حقیقی ہدایت ہے، یعنی مستقیم، کامل صحیح اور ہر خیر پر شامل ہے"۔

علامہ ابوعبداللہ القرطبی کا ارشاد ہے "جس ہدایت حقہ پر اللہ کی طرف سے تم ہو اے محمدؐ، جس کو اللہ جس کے دل میں چاہتا ہے ڈالتا ہے، وہی حقیقی ہدایت ہے نہ کہ وہ جس کی طرف یہ لوگ بلاتے ہیں"۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ اور یہ جو فرمایا کہ "بالفرض تم ان کی اہواء کی پیروی کرو"، اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کا خطاب کبھی حضورؐ سے ہوتا ہے لیکن مرادیں کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ اس آیت میں بھی یہی ہے اور تین توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ خطاب آپ سے ہے لیکن امت کو تنبیہ کرنی مقصود ہے۔ دوسری یہ کہ خطاب ہی امت سے ہے۔ تیسری یہ کہ اسلام اور ہدایت الٰہی کی عظمت بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا گیا، کیونکہ حضورؐ کا ان کی پیروی کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ مستحیل ہے۔ لیکن بفرض محال ایسا ہو جائے تو ولایت و نصرت سے محرومی ہو جائے۔ لیکن چونکہ رسولؐ کے لیے یہ عقلاً و شرعاً مستبعد و مستحیل ہے اس لیے امت کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں وہ اس مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ ان تینوں معانی کی مختصر سند صرف تین مفسرین کرام کے اقوال سے پیش کرتا ہوں۔

ابن حیان لکھتے ہیں "ظاہر یہی ہے کہ لَنْ تَرْضٰی میں خطاب حضورؐ سے ہے، آپ سے ان کی رضامندی ایک ایسے معاملے پر معلق کی گئی ہے جس کا واقع ہونا آپ سے مستحیل ہے، یعنی ان کی ملت کا اتباع، اور مستحیل چیز پر جو چیز معلق کی جائے وہ بھی مستحیل ہوتی ہے"۔ محمود آلوسی قول الٰہی " مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ " کی تفسیر میں رقم طراز ہیں "خطاب رسول خداؐ کی طرف ہے اور شرط کو مقید یہ ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا کہ ان کی خواہشات کی

پیروی آپ کے لیے محال تھی، کیونکہ یہ اس کے خلاف ہے جس کی صحت کا علم (قطعی) ہے، پس اگر بالفرض یہ واقع ہوجائے جیسے کہ مستحیل مفروضہ واقع ہوجائے تو کوئی ولی اور نصیر نہ ہوگا۔" ابن کثیر کا قول ہے" اس میں سخت تہدید اور شدید وعید ہے امت کے لیے کہ یہود و نصاریٰ کے طریقوں کی پیروی کریں قرآن وسنت کا علم جاننے کے بعد، اللہ اس بات سے پناہ میں رکھے، یہ خطاب اس طرح رسولؐ کو ہے لیکن حکم امت کو ہے۔"

علم سے مراد وحی، اسلام اور قرآن مفسرین نے بیان کیے ہیں، اور سب دراصل ایک ہی معنی میں ہیں، امام احمد بن حنبلؒ نے قرآن کو مخلوق کہنے والے کے حق میں کفر کا فتویٰ اسی آیت سے دیا تھا، فرمایا تھا "قرآن علم الٰہی ہے مخلوق نہیں" (تفسیر قرطبی)۔

اسلام ہی وہ ہدایت ہے جس سے دشمن مسلمانوں کو ہٹانا چاہتے ہیں

اس آیت کی مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام ہی راہ ہدایت ہے اور قیامت تک ساری انسانیت اس کے دامن میں سکون پا سکتی ہے، اور جو اہل کتاب حق و انصاف کے طریقوں پر سوچتے ہیں، ہدایت دل کے بند دروازوں کو ان کے لیے دستک دیتی ہے اور وہ اسلام کے نور سے منور ہوجاتے ہیں، اور اہل کتاب میں سے جو بھی اس دائمی نور ہدایت کو قبول کرتا ہے اس کی جھولی رحمت و مرحمت کے دو خزانوں سے بھرپور طور پر معمور رہتی ہے۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ	اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان
كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ	لے آؤ تو دے گا تم کو رحمت کے دو حصے اور تمہارے
نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ	لیے روشنی بنا دے گا کہ اس پر تم چلو، اور تمہیں
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ	بخش دے گا، اللہ غفور و رحیم ہے، تاکہ اہل کتاب
الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ	یہ نہ سمجھیں کہ وہ اللہ کا فضل حاصل کرنے پر قادر
فَضْلِ اللّٰهِ۔ (حدید-۲۸-۲۹)	ہی نہیں ہیں۔

اور جو بھی کتاب کو حق تلاوت ادا کرکے پڑھے گا اور تعصب سے دور ہوکر سوچے گا اس پر حق واضح ہوجائیگا۔ چنانچہ فرمایا يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (بقرہ-۱۲۱) - اور وہ زندگی کے اندھیروں والی راہوں کو چھوڑ کر ششش جہت روشنی والی مستقیم شاہراہ پر چل کھڑا ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ خالق دو عالم نے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو جس عظیم خطرے سے پہلے دن سے واقف بنایا تھا وہ اپنی نادانی اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کو بھول گئے، اور یہود و نصاریٰ کی بین الاقوامی سازشوں اور مکر و فریب نے سامراجی دور میں اور اس کے بعد بھی اسلامی

شریعت، اسلامی حکومت اور اسلامی نظام حیات پر نت نئے ناموں سے اعتراض کیے، انہوں نے نئے نئے نعرے ایجاد کیے، زمین، زبان، ترقی و تمدن، ریسرچ وغیرہ۔ لیکن ان سب کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا تھا اور کام کر رہا ہے وہ اسلام دشمنی ہے، اور دو ہزار سالہ اختلافات اور عظیم اختلافات جن کی رو سے حضرت مریمؑ و عیسیٰؑ پر فحش بہتان تک بیہودہ لگاتے ہیں، اس کے باوجود وہ پوپ کی طرف سے تکریم کے مستحق ہیں اور بڑی حکومتوں کی طرف سے نوازشات کے قابل، اور ان کے تمام اختلافات اسلام دشمنی کے متحدہ محاذ پر ختم ہو گئے ہیں اور نام بدل بدل کر ان کی جو اسکیمیں اور پلان ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ اس عالمی دعوت الٰہی کو مسلمان چھوڑ دے اور اسلام سے دستبردار ہو کر یہودیت یا نصرانیت قبول کر لے۔

علماء و مفکرین اسلام کا جہاد اور اس کے اثرات | ہوائے باطلہ نہ سننے اور تحکیم کتاب کے مطالبے کو منوانے کے لیے سامراجی دور ہی سے اہل علم و فکر نے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ سامراج کے خاتمہ کے بعد بھی مشکلات کے زیر سایہ بلکہ یوں کہیے کہ زندان و سلاسل کے اندر اور تلواروں اور پھانسیوں کی چھاؤں میں شریعت اسلامیہ، قانون اسلامی، خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر حکومت کی بنیاد قائم کرنے کا پودا سیراب ہوتا رہا اور الحمد للہ بہت جلد وہ وقت آگیا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان، اسلامی قانون اور اسلامی نظام حیات کو دوبارہ نافذ اور جاری کرنے کے خواہشمند نظر آتے ہیں۔ جنوب شرق ایشیا سے لے کر شمال افریقہ تک زندگی کی ایک نئی لہر نمودار ہے اور جذب و شوق میں ڈوبی ہوئی اسلامی اقدار کی محافظ فوج ظفر موج، علم و عمل، زبان و قلم اور قانون کے ذریعے اتر آئی ہے، اور محض اللہ کے فضل و کرم اور مخلصین و مومنین و مفکرین کے مسلسل اور منظم اور تعمیری جہاد بالقلم والنفس کی وجہ سے، اور عامۃ المسلمین میں بحمدہ تعالیٰ دینی بیداری کے سبب سے آج یہ افکار اہل حکومت و قانون تک پہنچ گئے ہیں اور ایک نئی سحر نمودار ہونے کے لیے بطن گیتی میں کروٹیں لے رہی ہے۔ اس سلسلے کی ایک عظیم کوشش لیبیا کی عظیم قوم بھی اپنی نوجوان مسلم قیادت کے زیر اثر کر رہی ہے، (اس کی کچھ تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی)۔

اسلامی اقدار کے احیاء میں دینی مدارس کا کردار | اسلامی اقدار کی بیداری اور اس نئے عزم کے سلسلے میں یہ حقیقت بیان کرنی ضروری ہے کہ جس طرح اسلامی تفکیرات نے جوش اور اسلام کے لیے اخلاص پیدا کیا اسی طرح دینی اداروں اور تعلیم گاہوں نے اور خصوصیت کے ساتھ جامعہ ازہر نے اس سلسلے میں ایک تاریخی کام کیا ہے۔ وہ یہ کہ سامراج کے دور میں بار بار دینی تعلیم کو ختم کرنے یا بے اثر کرنے کی تحریکیں تجدید وغیرہ کے نام پر اٹھیں، اور یہ اعتراض بھی

اکثر مسلمانوں کے ذہن میں آنے لگے کہ فقہ اسلامی کے وہ ابواب جن پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے، جیسے کتاب البیوع، کتاب العتق، کتاب الحدود وغیرہ، وہ کیوں پڑھائے جاتے ہیں؟ اگر بات صرف اتنی ہوتی اور اخلاص کے ساتھ ہوتی کہ دینی تعلیم کے اسلوب کو بدلا جائے اور زمانہ سے جتنا ممکن ہو ہم آہنگ کیا جائے، تحقیق اور بحث کا دروازہ کھولا جائے تقابلِ ادیان اور زندہ زبانوں کی تعلیم دی جائے، اجتہاد کی کوشش کی جائے (عوام کے لیے تو تقلید ضروری ہے)، لیکن مجتہد کے شرائط اہل علم میں پیدا کیے جائیں تاکہ وہ مسائل حاضرہ کے اسلامی حلول کتاب و سنت، اجماع و قیاس اور اجتہاد کے ذریعے کریں (جامعہ ازہر نے ان میں سے اکثر مطالبوں کو پورا بھی کیا ہے) تو یہ مطالبے نہ صرف یہ کہ اُس وقت ضروری تھے بلکہ اب بھی برصغیر کے دینی مدارس کے فرسودہ نظام تعلیم و تربیت و نصاب، اور طرز طریقوں میں تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر اخلاص کے ساتھ، انانیت اور خود پسندی کے جذبات غیر اسلامی کو پس پشت ڈال کر یہ کام علماء و مفکرین اسلام، اسلامی خطوط پر کریں تو بہت آسانی سے دینی تعلیم کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور مسلمانوں کی دینی و فکری ضروریات کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ جگہ جگہ دینی مدرسوں اور مختلف نصابوں کے بجائے ایک ہی متحد نصاب کے ماتحت دینی تعلیم پروان چڑھ سکتی ہے۔ اس کا انتظام و انصرام کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں نہ ہو کہ فرد واحد اگرچہ عالم و فاضل اور صوفی و بزرگ ہو اس میں مطلق العنانی اور ڈکٹیٹری کی خواہشِ نفس ابھرنے کے قوی امکانات موجود رہتے ہیں، بلکہ بین الملکی علماء کی ایک مجلس ہو جو ملک کے سارے دینی مدارس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے۔ یہ مجلس مخلص ہو، خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرتی ہو، حق کی گواہ ہو اور اس بات کی نگہداشت کرے کہ کوئی مدرسہ اپنے اصولوں سے منحرف نہ ہو، اور افراد کی دوستی، شہرت اور پروپیگنڈہ اس مجلس کے لیے معیار نہ ہو بلکہ میزان حق ہو۔ اس طرح دینی مدارس ایک عظیم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ (بہر حال دینی تعلیم اور دینی مدارس کی اصلاح کا موضوع بہت طویل ہے کسی دوسرے موقع پر ہی اسے چھیڑا جا سکتا ہے)۔ بات یہ چل رہی تھی کہ اصلاح کا مطالبہ تو صحیح ہو سکتا تھا، لیکن یہ بات بالکل غلط تھی کہ اسلامی تعلیمات کے اصولی اور کلی اجزاء اس لیے چھوڑ دیے جائیں کہ ملک میں رائج نہیں ہیں اور کتاب الٰہی کے وہ فقہی احکام جن کا رواج و نفاذ سامراج نے ختم کیا تھا اسلامی مدرسے اس کی تعلیم بھی ختم کر دیتے۔ یہ مطالبے نہیں مانے گئے اور نہ ان اعتراضات کی پروا کی گئی۔ دنیا جہان کے دینی مدارس کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے فقہ اسلامی و شریعت اسلامیہ کے وہ ابواب اور مسائل بھی ہمیشہ پڑھائے جو وقتی طور پر نافذ نہ تھے لیکن جن کے نافذ ہونے کی مستقبل میں امید تھی اور جن کے پڑھائے بغیر شریعت کاملہ کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی، خصوصیت کے

ساتھ جامعہ ازہر نے ہمیشہ مذاہب اربعہ کی فقہ تحقیق و تفصیل کے ساتھ پڑھائی، تعصب اور دلائل کو زبردستی ٹھونسنے کی ضرورت اس لیے پیش نہ آئی کہ ایک ہی جگہ پر الگ الگ ہر مذہب فقہ کے طالب علم کے لیے اس کی فقہ پڑھنی ممکن ہے۔ دوسرے مذاہب کے مراجع اور علماء اسے دستیاب ہو سکتے ہیں اور مقارنہ و موازنہ کے ساتھ استنتاج و استنباط کی صلاحیت اس میں پیدا ہو سکتی ہے تو پھر اسے تعصب کی کیا ضرورت ہے؟ بہر حال ان مذاہب اربعہ کی تعلیم اور موازنے کے باب میں دوسرے اقوال فقہیہ کی بھی تعلیم جامعہ ازہر کا کارنامہ تھا اور ہے، ان فقہ اسلامی کے مذاہب اور غیر ملک میں غیر موجود و غیر معمول ابواب فقہ کی تعلیم اور مشق سے یہ ہوا کہ جوں ہی اسلامی نظام زندگی اور اسلامی قانون کی گفتگو ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ مصر میں (جسے بعض علم سے ناآشنا اور خود فریبی میں مبتلا حضرات علم و تحقیق سے عاری ثابت کرنا چاہتے ہیں) علمی و تحقیقی کارنامے بجائے خود ان حضرات کا جواب پیش کرتے ہیں۔ ہزاروں اسلامی قانون کے ماہر پیدا ہو گئے۔ ازہری علمائے کرام نے قدیم علم کتاب و سنت و مذاہب فقہ کو پیش کیا، اور فقہ اربعہ سے مکمل واقفیت سے قبل کوئی شخص قانون اسلامی کے ماہر ہونے کا دعوی اگر کرے تو یہ دعوی کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ پھر اسلامی تفکیر کے زیر سایہ ججوں، وکیلوں، اور قانون دان حضرات نے اسلامی قوانین کا موازنہ عالمی قوانین سے کیا۔ اب پلک جھپکنے میں اسلامی قانون عالم وجود میں آسکتا ہے۔ اگر فقہ اسلامی کی تعلیمات گذشتہ دو سو برس میں کسی ایک مذہب فقہی کی باقی رہ جاتیں یا صرف عبادات وغیرہ تک محدود کر دی جاتیں تو فقہ اسلامی میں جمود آجاتا اور ان موضوعات سے متعلق جو اسلامی ملکوں میں رائج نہیں تھے، نہ کتابیں چھپتیں نہ تحقیقات ہوتی اور نہ وقت پڑنے پر پورے عالم اسلامی میں علماء و مفکرین فوج در فوج اس کام کے لیے نکل آتے اس لیے کہ گو اسلامی ملکوں اور قانونوں میں اگرچہ یہ چیزیں موجود نہیں تھیں لیکن اہل علم و ایمان کے سینوں اور سفینوں میں یہ دولت پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ تھی۔

اسلام ایک کلی نظام حیات اور مکمل لائحہ عمل ہے

دراصل اسلام ایک مکمل اور ابدی دین ہے اور انسانی حیات سے متعلق سارے شعبوں میں اس کی تعلیمات ایک فعال اور قوی اثر رکھتی ہیں۔ جس طرح اسلام انسان کو زندگی اور موت کی تمام حقیقتوں سے باخبر بناتا ہے بالکل اسی طرح وہ انسانوں کو عبادات و اخلاق سے لے کر معاملات و اجتماعیات تک میں احکام بھی عطا کرتا ہے۔

اسلام ایک کُل ہے۔ اس کی پیروی جزوی طور پر مجبوری کے حالات میں تو کی جا سکتی ہے، لیکن اس کو پوری طرح بروئے کار لانے کی کوشش جو کر سکتا ہو اور نہ کرے تو یہ ایک گناہ بھی ہے اور محرومی بھی۔ اسلام صرف عبادات کا

مذہب نہیں ہے اور نہ اسلام انسان کی ذاتی اور پرائیویٹ زندگی کا مسئلہ ہے، بلکہ اسلام کے احکام ایک مسلمان کے پورے کاروان حیات کو ساحل مراد سے ہم کنار کرتے ہیں۔

اسلام دنیا و آخرت، عبادات و اجتماع اور حکومت و قانون سب کا دین ہے اور ہر مسئلہ کا حل قیامت تک اس کی تعلیمات میں مل سکتا ہے۔ اسلام نے جس طرح نماز، روزہ اور حج کے مسائل بیان کیے ہیں جو انسان کی ذاتی اصلاح اور تقویٰ میں مفید ہیں اور بندے کو اپنے آقا اور خالق و مالک کے دربار تک پہنچاتے ہیں، بالکل اسی طرح زکوٰۃ کے احکام کی تفصیلات، صدقہ، برّ، اور خیر خیرات کے سارے طریقوں کو واضح کیا ہے تاکہ اسلامی سوسائٹی ایک جسم بن کر رہے۔ اور امیر و غریب کے درمیان وہ تفاوت اور نفرت پیدا نہ ہو جو غیر اسلامی سوسائیٹیوں کا شعار ہے۔ اسلام نے اسی طرح سود، جوا، سٹے بازی، رشوت، اشیاء خوردنی میں بلیک مارکٹ یا ذخیرہ اندوزی اور اس قبیل کی وہ ساری چیزیں منع کر دیں جن سے اقتصادی عالمی مشکلات پیش آتی ہیں۔ اسلام کا نظام اخلاق تاریخ عالم کا مجرب اور بہترین نظام اخلاق ہے۔ اسلام نے چوری، ڈاکہ، زنا، جھوٹ، تہمت، قتل، تمام نشہ آور اشیاء اور ہر مُخَرِّب اخلاق چیز پر پابندی لگادی، اور اصلاح قلب و نظر کے وہ تربیتی طریقے اختیار کیے جن سے قلب و نظر اور عقل و ضمیر کو آسودگی حاصل ہو اور سوسائٹی میں جرم کم سے کمتر ہوں۔

ان تمام اصلاحی تدابیر اور اخلاقی وعظ و نصیحت، اور قلب و نظر کو اپیل کرنے والی تعلیمات کے باوجود بھی جہاں انسان موجود ہیں وہاں گناہ ممکن ہے۔ وہاں جرم ہو سکتے ہیں۔ غیر اسلامی قانون کی تاریخ شاہد ہے کہ جوں جوں نئے سے نئے اور سخت سے سخت قوانین نکالتے ہیں اسی رفتار سے جرائم کا سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے، مجرموں کی پشت پناہی کرنے کا مرض بھی عام ہوتا جاتا ہے، تمام قانونی و اخلاقی ادارے اپنی ہار مان کر بیٹھ جاتے ہیں اور جرم کی رفتار برق کی رفتار کی طرح بڑھتی جاتی ہے۔ جرموں کی سالانہ عالمی رپورٹوں کی ایک جھلک دیکھ کر ہر پڑھا لکھا شخص یہ معلوم کر سکتا ہے کہ جرم کی رفتار، تعداد، نوعیت اور نت نئی اقسام میں کس طرح دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی جاتی ہے، اور جو ملک جتنا زیادہ ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ، اور متموّل و غنی ہے، سعادت قلب اور سکون حیات سے اسی کے بقدر دور ہے اور اخلاقی مشاکل اور جرموں کی کثرت و جدت کے سامنے بے دست و پا ہے۔ (باقی)

ایمان اور معاشرتی زندگی[1]

(عبدالحمید صدیقی)

دنیا کے ناپائیدار فوائد کے لیے بھائی بھائی پر ظلم و ستم کرتا ہے بیٹا، باپ کا گلا کاٹ دیتا ہے، امانت میں خیانت کی جاتی ہے اور عہد و پیمان توڑ دیے جاتے ہیں۔ متاعِ دنیا وہ چیز ہے جس نے انسانوں کو حدودِ انسانیت سے تجاوز پر اکسایا، چوری اور ڈاکہ زنی پر ابھارا اور انسانی معاشرہ کچھ ایسی شکل اختیار کر گیا جیسے درندوں کی بستی ہو۔ تجار دھوکا فریب کرتے ہیں۔ امراء [illegible] ظلم و سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ اور قضاۃ و حکام رشوتیں لیتے ہیں اور راہِ حق و صواب سے انحراف کرتے ہیں۔ اہلِ علم کتمانِ حق کرتے ہیں، مفتیانِ کرام غلط فتاویٰ صادر فرماتے ہیں۔ اہلِ قلم کذب و افتراء کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، شعراء اشراف کی ہجو پر اُتر آتے ہیں۔ ان سارے مذموم اعمال کا محرک کیا ہوتا ہے؟ صرف ایک چیز۔ دنیا اور اس کے فوائد و منافع۔ اور یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور نہ یومِ حساب پر ایمان رکھتے ہیں دوسرے لفظوں میں جو عقیدہ و ایمان سے عاری ہوتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کا ایک مکالمہ نقل فرمایا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غلط کار لوگوں کو اعمالِ خیر کی توفیق نہ ملنے اور اعمالِ شر ہی میں منہمک رہنے کی وجہ فقط ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا فقدان ہے۔ اہلِ ایمان جنت میں داخل ہونے کے بعد، عذابِ دوزخ میں مبتلا لوگوں سے سوال کریں گے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ ۔ تمہیں دوزخ میں کس چیز نے داخل کیا۔

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ (مدثر۔ ۴۲۔ ۴۶)	وہ جواب دیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے اور ہم مساکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے نیز ہم خدا اور رسول کی تعلیمات پر نکتہ چینی کرنے والوں کے ساتھ مل کر نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ اور ہم روزِ جزا

[1] اس مضمون کا بیشتر مواد شیخ یوسف قرضاوی کی کتاب الایمان والحیات سے ماخوذ ہے۔

کی تکذیب کرتے تھے۔

اسی طرح فرعون کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ (قصص: ۳۹)

زمین میں (خود فرعون) بڑا بنا اور اس کے لشکروں نے بھی ناحق تکبر کیا اور ان کا گمان تھا کہ وہ (مرنے کے بعد) ہماری طرف نہیں پلٹیں گے۔

مقصود یہ ہے کہ دنیوی ساز و سامان کے حصول کی طرف انسان بہت شدید میلان رکھتا ہے۔ اور اسی کام میں بسا اوقات ساری عمر گنوا دیتا ہے اور خدا و یوم آخرت۔ کسی کا بھی خوف اس کے دل کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس دلدل سے انسان کو اگر کوئی قوت نکال سکتی ہے تو وہ عقیدہ و ایمان کی قوت ہے۔ جہاں یہ قوت مفقود ہو گئی یا ضعف و اضمحلال کا شکار ہوئی تو وہیں سے انسان بے لگام ہو کر ایسی حرکات کا ارتکاب شروع کر دیتا ہے جو انفرادی و اجتماعی زندگی کا ستیاناس کر دیتی ہیں۔

فرعون کے فساد فی الارض کی وجہ کیا تھی؟ یہی کہ وہ یوم آخرت پہ ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہوتا کہ موت کے بعد مجھے ایک علیم و خبیر خدا کے روبرو اپنے ہر عمل کی جواب دہی کرنی ہے تو وہ کبھی ظلم و ستم نہ کرتا۔ اور آتش دوزخ کے مہیب شعلوں میں سڑنے والوں نے کس بات کا اعتراف کیا اور اعمالِ خیر سے تہی دامن ہونے کی کیا وجہ بیان ہو صرف یہی کہ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ۔ ہم روزِ جزاء کو جھٹلاتے تھے۔ کیونکہ روزِ جزا کی تصدیق کا عقیدہ ہی تو وہ قوت تھی جو انہیں ترغیب حسنات بھی دیتی اور ارتکاب سیئات سے باز بھی رکھ سکتی تھی۔

دوسری طرف دیکھئے سر و سامانِ دنیا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ آپ کے پہلوئے مبارک پہ چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں کیا اس سے زیادہ نرم و نفیس بچھونا نہ مہیا کر دیا جائے۔ جواب رسالتمآب سنیئے اور ایمان کے اُن گہرے اثرات کا اندازہ کیجئے جو حیات انسانی پہ مرتب ہو کر رہتے ہیں۔ مجھے سر و سامانِ دنیا سے کیا واسطہ۔ میری اور دنیا کی مثال تو ایسے ہے جیسے کوئی مسافر دن کی گرمی میں چلتا رہے اور کسی سایہ دار درخت کے نیچے پل بھر کے لیے ٹھہرے پھر اسے چھوڑ کر آگے چل دے۔ اور یہ دیکھئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مخاطب دنیا ہے جو حسین و جمیل دوشیزہ کا روپ دھارے سامنے کھڑی ہے۔ جا اور نظر کو فریب دینے والی جا کسی اور کو فریب دے۔ مجھ سے تعرض کرتی ہے؟ یا میری طرف میلان رکھتی ہے؟ میں تجھے تین طلاق دے چکا ہوں۔ اب رجوع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

یہ کون بول رہا ہے؟ ابنِ ابی طالب نہیں۔ جذبۂ ایمان سے سرشار علی مرتضیٰ بول رہے ہیں۔ اُن کا ایمان بول رہا ہے۔ جس کا نصب العین مال و متاعِ دنیا نہیں اس سے بہت بلند و برتر، بہت عظیم و جلیل اور بہت بیش قیمت انعاماتِ خداوندی ہیں ما لا عین رأت ولا اذن سمعت وما خطر بقلب بشر۔

پس ایمان ہی وہ منفرد جوہر ہے جو مومن کے اندر، ترغیباتِ دنیا کو ٹھکرا دینے کی تاب و تواں پیدا کرتا ہے۔ اس کے دل کو اس یقین سے معمور کر دیتا ہے کہ اللہ کے نزدیک روئے ارض کی ساری دولت بھی مچھر کے پر کے برابر قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ وہ اسے دنیا کا غلام نہیں بننے دیتا لیکن یہ بات واضح رہے کہ ایمان سر و سامانِ دنیا کے استعمال و استمتاع سے نہیں روکتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کو مقصودِ اصلی نہ سمجھو، غایت الغایات نہ قرار دو۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایمان و اخلاق کا مقابلہ کرنا تو درکنار، مادی سر و سامان اور دنیوی لذائذ و منافع کے اندر اتنی سکت بھی نہیں کہ وہ اس کا سامنا ہی کر سکیں۔

طبیعت و جبلّت کی قوت اور ایمان کی قوت

معاشرہ کو سعادت کے مرتبۂ کمال تک پہنچانے کے لیے جن اصول اخلاق کی ضرورت ہے اُن میں سے ایک کا اثبات ہو چکا یعنی مال و متاعِ دنیا کی تحصیل کو اصلی اور حقیقی نصب العین نہ بنایا جائے اور اسے کبھی یہ حیثیت نہ دی جائے کہ دین و ایمان کے تقاضے مجروح ہونے لگیں۔ اس کے بعد ہم یہ گذارش کریں گے کہ دوسری چیز جسے افرادِ معاشرہ کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے وہ جبلی و فطری داعیات پر ضبط ہے۔ ان داعیات میں سب سے طاقتور داعیہ جنس کا ہے جس کو عام حالات میں بھی قابو میں رکھنا بڑا دشوار ہے لیکن ایامِ شباب میں تو خاص طور پر یہ تمام حدود سے تجاوز کر جانا چاہتا ہے۔ اس عالم میں نہ اسے کسی قانون کا پاس ہوتا ہے نہ کسی فلسفی کے افکار و نظریات سے کوئی واسطہ۔ یہ حدود و قیود نا آشنا داعیہ اگر کسی قوت کی مزاحمت کے آگے بے بس ہوتا ہے تو وہ ایمان کی قوت ہے۔ حضرت یوسف علی نبینا و علیہ السلام نوجوان ہی تو تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایسے ماحول میں پہنچا دیے گئے جہاں داعیۂ جنسی کی تسکین کے سارے سامان موجود تھے۔ ایک منصب و جمال سے بہرہ ور خاتون خود دعوتِ گناہ دے رہی تھی۔ وہ خاتون جو حاکمِ وقت کی اہلیہ تھی ذی اقتدار و ذی شان اور ان کی مالکہ اور یہ اُس کے غلام مجبور۔ دونوں تنہا تھے۔ قانون کی نظر سے مستور اور لوگوں کی دسترس سے دُور۔ غور فرمائیے اُس وقت کیا چیز سیدنا یوسف کی ممد و معاون بنی جس نے خود ان کے داعیۂ جنسی کو بھی ضبط میں رکھا اور اُس مشتعل خاتون کی بھی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کی۔ یہ صرف ایمان تھا۔ خدا کے حاضر ناظر ہونے پر ایمان۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور اللہ کے محاسبہ و مواخذہ پر

ایمان۔ اور اس بات پر ایمان کہ اپنے داعیۂ جنسی کی تسکین کی یہ صورت حرام ہے اور خدا کے غضب کو دعوت دینے والی اور اس کی رحمت سے دور کر دینے والی ہے۔ یہ سیدنا یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر تھا جو خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ اور جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء و رسل غیر معمولی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں۔ تو آئیے ایک عام عورت کا واقعہ سنیئے۔ حضرت عمرؓ کا عہدِ خلافت تھا۔ آپ رات کو عامۃ المسلمین کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے گشت کر رہے تھے۔ ایک مکان کے پاس سے گزرتے وقت آنجناب نے سُنا ایک عورت پرسوز آواز میں گا رہی تھی۔ اُس کے لیے اپنے شوہر کی جدائی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی جو مملکت اسلامیہ کی سرحدوں پر جہاد و قتال میں مصروف تھا اور کئی مہینوں سے گھر نہیں آسکا تھا۔ نوجوان دوشیزہ کے جذبات اشعار کی صورت میں ابل پڑے تھے ؎

لَقَدْ طَالَ هٰذَا اللَّيْلُ وَاسْوَدَّ جَانِبُهٗ ۔۔۔ وَاَرَّقَنِيْ اَنْ لَّا حَبِيْبَ اُلَاعِبُهٗ

فَوَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ تُخْشٰى عَوَاقِبُهٗ ۔۔۔ لَحُرِّكَ مِنْ هٰذَا السَّرِيْرِ جَوَانِبُهٗ

رات تاریک اور طویل ہوگئی ہے۔ اور میری نیند غائب ہو چکی ہے کیونکہ کوئی محبوب نہیں جس کے ساتھ میں دل بہلاؤں۔ خدا کی قسم اگر اللہ کا ڈر نہ ہوتا اور اس کے احکام کی نافرمانی کے نتائج و عواقب کا خوف نہ ہوتا تو اس پلنگ کے اطراف و جوانب کو ہلا ڈالا جاتا۔

داعیۂ جنس کی طرح جبلی طور پر انسان میں ایک اور زوردار داعیہ غضب و انتقام کا بھی موجود ہوتا ہے۔ جو بسا اوقات اتنی شدت اختیار کر جاتا ہے کہ مغلوب الغضب انسان پر وحشی اور درندے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ داعیۂ غضب جب زور پکڑتا ہے تو وہاں نہ کسی قانون کا بس چلتا ہے نہ کوئی فلسفۂ اخلاق کام آتا ہے۔ معمولی باتوں پر لوگ جھگڑ پڑتے ہیں اور آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ نتیجتہً قتل و غارتگری کا بازار گرم ہو جاتا ہے معاشرتی زندگی میں تصادم کی بے شمار صورتیں جو آئے دن پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کے پیچھے کیا محرک کارفرما ہوتا ہے۔ یہی داعیۂ غضب۔ اِس شعلۂ جوالہ کی حدّت کو کم کرنے والی اور بالآخر اسے ٹھنڈا کر کے رکھ دینے والی چیز ایمان کے سوا اور کوئی نہیں۔ ایمان آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ غصہ کو تھوک دے۔ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دے۔ جہالت کے بدلے پر صبر و حلم سے کام لے بلکہ برا سلوک کرنے والے کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں نے قربانی کی۔ ایک کی قربانی قبول ہو گئی جبکہ دوسرے کی قربانی نامقبول ٹھیری۔ اس پر مؤخر الذکر بیٹا غصہ میں آ گیا اور مشتعل ہو کر کہنے لگا

لَاَقْتُلَنَّكَ ' میں تجھے قتل کرکے دم لوں گا۔ مگر صاحبِ ایمان بیٹا اشتعال کے جواب میں گرمی نہیں دکھاتا۔ بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کہتا ہے:

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ	اللہ تو اہلِ تقویٰ ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔
لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ	اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو
مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْۤ	میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔
اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ المائدہ ۲۷/۲۸	میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

معلوم ہوا کہ اللہ رب العالمین سے ڈرنے والے کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہوتے۔ نہ غیظ و غضب کے عالم میں حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ کسی کے خلاف ظلم و زیادتی کرنے سے انہیں خوفِ خدا روکے رکھتا ہے چاہے جبلی داعیات کا اقتضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے "خدا سے ڈرنے والے لوگ اپنے غیظ و غضب کی تسکین کا سامان نہیں کرتے۔ جو جی میں آتا ہے اسے کر گزرنے سے انہیں خوفِ خدا مانع ہوتا ہے اور اگر یوم قیامت نہ ہوتا تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا جو تم دیکھ رہے ہو۔" حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز سے ایک آدمی ہمکلام ہوا اور آنجناب سے نہایت بری طرح پیش آیا حتیٰ کہ آپ غضبناک ہو گئے۔ آپ اُس وقت امیر المومنین تھے۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اسے درست کر دیا جائے لیکن بعد ازاں رک گئے۔ اور اس آدمی کو مخاطب کرکے فرمانے لگے "تمہاری کوشش تو تھی کہ میرے اندر کا شیطان نشۂ اقتدار کے زیرِ اثر مجھے بھڑکاتا اور میں تمہاری خوب خبر لیتا جس کی پاداش میں کل قیامت کے دن تم میرا دامن پکڑ لیتے۔ لیکن اب جاؤ اللہ تمہیں معاف کرے۔ میں تمہارے ساتھ مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔"

پس ثابت ہوا کہ ایک سعادت مند معاشرہ کے افراد کو اخلاق کے اس مقامِ بلند پر فائز ہونا چاہیئے جہاں جبلی داعیات ایمان کی بالادستی کو قبول کر لیتے ہیں اور خود کو مکمل طور پر اس کی تحویل میں دے کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

ایمان انانیت کو فطری حدود سے آگے بڑھنے نہیں دیتا انانیت یا اپنی ذات سے محبت ایک فطری امر ہے۔ اور کوئی فرد بھی اس سے خالی نہیں۔ اپنی انا کی برتری اور اپنی ذات کے وقار کا سوال عام طور پر انسانوں کے نزدیک زندگی کا سب سے اہم سوال بن جاتا ہے۔ اپنا بول بالا رکھنے کے لیے، اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے اور اپنی عزت و اقتدار کا بھرم قائم کرنے کے لیے جذبۂ انانیت خاص طور پر ابھرتا ہے اور معاشرتی زندگی میں خصومت و نزاع کے سینکڑوں بیج بو جاتا ہے۔ اس جذبۂ فاسد نے کتنے خاندانوں کی عزت خاک میں ملا دی، کتنے قبیلوں کو آپس میں لڑا دیا

اور کتنی قوموں کو برسوں متحارب رکھا۔ انسانی تاریخ میں یہ پورا ریکارڈ دیکھا جا سکتا ہے۔

اِس جنون میں جب کوئی فرد یا معاشرہ مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر کم ہی کوئی چیز اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہوا کے گھوڑے پر جب انانیت زدہ لوگ سوار ہوتے ہیں اور پندارِ نفس اسے برابر مہمیز لگاتا ہے تو اس وقت کوئی ضابطہ، کوئی قانون اور ہوش و خرد کی کوئی مقدار بھی اسے زنجیر پا نہیں کر سکتی۔ ایمان کی لگام البتہ ایک ایسی چیز ہے جو اس کی سرکشی کو دور کر سکتی ہے۔ ایمان سب سے پہلے انسان کو اس کی حقیقت سمجھاتا ہے تاکہ اپنے بارے میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہونے پائے۔ اس طرح وہ اس جڑ ہی کو کاٹ دیتا ہے جہاں سے شاخِ انانیت غذا حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ دین و ایمان کی رو سے انسان اللہ کی مخلوق ہے۔ اللہ کے سہارے زندہ ہے۔ اس کی تمام صلاحیتیں اور استعدادیں اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ کوئی ایک چیز بھی اس کی اپنی نہیں۔ نہ اس کا رزق اس کے بس میں ہے نہ زندگی نہ موت نہ عزت اور ذلت کا یہ مالک ہے نہ حکومت و اقتدار اس کی ذاتی شے ہے۔ توفیق الٰہی کے بغیر یہ دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کوئی کام تو در کنار اس کے لیے ایک تنکے کو بھی زمین سے اٹھانا اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک سانس بطورِ خود لے لینا ایک بات تک کر سکنا اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں۔ جب انسان کی اوقات یہ ہے اور اس اوقات کا شعور بھی وہ رکھتا ہو تو انانیت کا غلط جذبہ اس کے دل میں کہاں پیدا ہو سکتا ہے؟ اور اگر کسی نہ کسی طرح پیدا ہو جائے تو خدا پر ایمان، حشر نشر اور جنت و دوزخ پر ایمان اسے معطل اور مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لیے آئے۔ وہ میراث کے بارے میں جھگڑ رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر تھا ھذا حقی (یہ میرا حق ہے)، مگر ثبوت کسی کے پاس بھی نہ تھا۔ تاہم دوسرے کے حق کا انکار بڑی شد و مد سے کر رہے تھے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ کر لیا کہ بات کچھ بھی نہیں ان میں سے ہر ایک کے اندر انانیت بول رہی ہے۔ آپؐ نے ان کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا "میں ایک انسان ہوں اور تم اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لیے میرے پاس آئے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی دوسرے کے مقابلے میں زیادہ چرب زبان ہو اور اپنے موقف کو بہتر طریقے سے بیان کر دے تو میں اس کی بات سن کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ لیکن یاد رہے کہ جس کو میں نے اس کے بھائی کے حق میں سے کچھ حصہ دے دیا وہ آگ کا ٹکڑا ہو گا۔ اسے چاہیے کہ دوسرے کے حق کو قبول نہ کرے"۔ جھگڑنے والوں نے جب یہ کلمات تنبیہ سنے تو ان کے اندر کا جذبۂ

خشیتِ الٰہی بیدار ہوگیا اور فکرِ آخرت دامنگیر ہوگئی۔ دونوں رو پڑے اور ہر ایک دوسرے کو کہنے لگا۔ میرا حق بھی آپ لے لیں۔ میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اب جب تم اس طرح سوچنے لگے ہو تو مناسب یہ ہے کہ اس ورثہ کو آپس میں تقسیم کرلو اور اپنا اپنا حق لے لو۔ اور تقسیم کرتے وقت اگر کسی کے حق میں سے کچھ دوسرے کے حصے میں جانے کا احتمال ہو تو درگزر سے کام لو۔ اور ہر ایک دوسرے پر اسے مباح قرار دیدے۔

غور فرمائیے کہ یہ نزاع جو سراسر انانیت کی پیداوار تھی۔ کس چیز کی بدولت ختم ہوئی۔ ایمان اور صرف ایمان کی بدولت۔ ایمان انا کے بت کو پاش پاش کرنے کے ساتھ آدمی کے اندر عفاف اور زہد و ایثار کے اوصاف بھی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ دوسرے کے حق سے دستبردار تو ہوتا ہی ہے اپنے حق کو بھی دوسرے کی جھولی میں بخوشی ڈال دینا چاہتا ہے۔ رسولِ پاک نے دو ایمانداروں کا قصہ بیان فرمایا۔ ایک نے دوسرے سے زمین خریدی۔ خریدار کو بعد میں زمین سے ایک مٹکا ملا جس میں سونا تھا۔ اس نے زمین فروخت کرنے والے کے سامنے سونے سے بھرا ہوا مٹکا رکھتے ہوئے کہا۔ اپنا سونا لے لیجئے میں نے آپ سے زمین خریدی تھی یہ سونا نہیں۔ دوسرا آدمی جو دولتِ ایمان سے مالا مال تھا گویا ہوا۔ میں نے زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب آپ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ رسولِ پاکؐ نے فرمایا بعد ازاں وہ دونوں ایک تیسرے آدمی کے پاس بغرضِ فیصلہ گئے۔ اس نے ان سے پوچھا تم صاحبِ اولاد ہو؟ ایک نے جواب دیا میرا ایک لڑکا ہے۔ دوسرا بولا میری ایک لڑکی ہے۔ فیصلہ کرنے والے نے کہا۔ دونوں کا آپس میں نکاح کر دو اور اس سونے کو مصرف میں لاؤ۔ پھر جو بچ رہے اسے صدقہ کر دینا۔ اس طرح دنیا کے سامنے یہ عجیب منظر آیا کہ سونے کا ڈھیر سامنے تھا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس کا طلبگار نہ تھا۔ ہر ایک اس سے بچنا چاہتا تھا اور ساتھی سے کہہ رہا تھا یہ تیرا ہے حالانکہ ایسے مواقع پر لوگ کہا کرتے ہیں۔ یہ میرا ہے صرف میرا۔

انانیت کا اس درجہ استیصال اور زہد و ایثار کا یہ کمال کسی معاشرہ کے افراد میں اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ اُس اخلاق سے متخلق ہوں جو ایمان کے زیرِ اثر پیدا ہوتا ہے۔ (باقی)

(بقیہ اشارات)

رضا کے لیے کام کرنا چاہیے اور ریا لواسطہ اور بلاواسطہ کوئی ایسی حرکت نہ کرنی چاہیے جس کا مقصد اپنی ذات اور شخصیت کو مصنوعی طور پر ابھار کر لوگوں کے اندر نمایاں کرنا ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا گیا کہ لوگوں میں افضل کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

كل مخموم القلب صدوق اللسان قالوا صَدُوق اللسان نَعرِفهُ فما مخموم القلب قال هو التقي النقي لا اثم عليه ولا بغي ولا غل ولا حسد (ابن ماجہ)

ہر وہ شخص جو مخموم القلب اور صدوق اللسان ہے۔ صحابہ نے عرض کی کہ صدوق اللسان کا مطلب تو ہم سمجھتے ہیں مگر مخموم القلب سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا: اس سے مراد صاف ستھرا اور پرہیزگار آدمی ہے جس کے دل پر کوئی گناہ کا داغ نہ ہو۔ نہ بغاوت کا نہ خیانت کا نہ حسد کا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کو ایک سیدھے سادھے، خدا سے ڈرنے والے، برائیوں سے بچنے والے اور نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصے لینے والے انسان کی طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اگر معاشرہ اس کی صلاحیتوں کے پیش نظر اُسے قیادت کے منصب پر فائز کرتا ہے تو پھر اسے اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہایت خلوص اور دلسوزی کے ساتھ سرانجام دینے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اگر جماعت یا معاشرہ اسے اس قابل نہیں سمجھتا تو پھر اسے ایک عام فرد کی حیثیت سے اُن سارے فرائض کو ادا کرنا چاہیئے جو مسلمان کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ اسے یہ بات ہمیشہ نگاہ میں رکھنی چاہیئے کہ اگرچہ کاخ و ایوان کے سب سے اوپر کے کنگرے یا برج و مینار لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنتے ہیں مگر ان کے استحکام کا سارا دارومدار ان بنیادوں پر ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کی نظروں سے یکسر مستور زیر زمین ان رفیع الشان عمارات کو سہارا دیے ہوئے ہوتی ہیں۔ ان عمارات کا حفظ و بقا صرف ان بنیادوں کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ چنانچہ تحریک اسلامی کی عمارت کو اٹھاتے ہوئے جہاں کچھ لوگ اس کے گنبد و مینار تعمیر کرنے پر مامور ہوتے ہیں، بعض کو اس کی تزئین و آرائش کا ایسا کام سپرد کیا گیا ہے، جو عوام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کا باعث بن سکتا ہے وہاں اُن خاموش اور سیرت و کردار کے لحاظ سے نہایت مضبوط کارکنوں کی بھی اشد ضرورت ہے جو اس تحریک کے لیے ٹھوس بنیاد کا کام دے سکیں اور شہرت و شہرت کی آزمائش سے بالکل محفوظ رہ کر خدا کے ہاں اپنے نیک اعمال کا پورا پورا اجر پا سکیں زیادت اور

سیادت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی قوت اور ناموری سے اگرچہ انسان نیکی اور بھلائی کے بہت سے کام سرانجام دے سکتا ہے مگر اس سے انسان ایک بہت بڑی آزمائش کی زد میں بھی آجاتا ہے جس سے بچ نکلنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا الا یہ کہ خداوند تعالیٰ اس پر اپنا خاص فضل کر کے اُسے اُس آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تیسری چیز جس کی طرف جماعت کے وابستگان کو خاص طور پر توجہ دینی چاہیے وہ حیاتِ دنیا کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ اسلام میں بلاشبہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں اور ایک مسلمان کے لیے اخروی فلاح کی جو منزل متعین کی گئی ہے اُس تک پہنچنے کا راستہ دنیا کے ویرانوں میں سے نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے ہنگاموں میں سے گزر کر جاتا ہے مگر اس حقیقت کو ہرگز نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک مومن کا تعلق اِس دنیا سے بس اتنا ہی ہونا چاہیئے جس کی نشاندہی اِس دنیا کے سب سے بڑے حقیقت شناس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اِن الفاظ میں کی ہے:

مالی وللدنیا وما انا والدنیا	مجھے مال و اسبابِ دنیا سے کیا تعلق ہے؟ میری
الا کراکب استظل تحت شجرۃ	اور دنیا کی مثال تو کچھ ایسی ہے جیسے ایک مسافر ایک
ثم راح وترکھا۔	سایہ دار درخت تلے کچھ دیر آرام کر کے بعد ازاں
(مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، بروایت ابن مسعودؓ)	اسے چھوڑ کر چل دے۔

ایک مسلمان کی نظر میں سب سے قیمتی سرمایہ اللہ کا دین ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز بالکل ہیچ اور بے وزن ہے اس لیے اسے دنیوی مال و متاع کی کسی بڑی سے بڑی مقدار اور قوت و اقتدار کے کسی اونچے سے اونچے منصب سے بالکل مرعوب نہ ہونا چاہیئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ	اور ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی آیتیں
وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ	اور عظمت والا قرآن عطا فرما دیا ہے تو آپ اس
عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا	فانی متاع کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے جو
مِّنْهُمْ۔ (الحجر ۸۷-۸۸)	ہم نے ان کے مختلف طبقوں کو دے رکھا ہے۔

اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ بلاشبہ تم بے سروسامان اور بے کس و مظلوم ہو لیکن خدا نے تمہارے دلوں کو قرآن حکیم جیسی لازوال دولت سے غنی کر رکھا ہے۔ اِس عظیم دولت

اور رشد و ہدایت کے اس سرمدی چشمے کے مقابلے میں دنیوی جاہ و جلال اور قوت و اقتدار کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ تمہیں جو کچھ ملا ہے وہ کائنات کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے اور جس کے پاس یہ سرمایہ ہے اُس کے قلب و نگاہ کو دنیا کی کوئی دوسری چیز مسخر نہیں کر سکتی۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل و عیال نے جس بے سروسامانی میں اپنی زندگیاں بسر کیں اُن سے کون ناواقف ہے؟ درآنحالیکہ دنیوی ساز و سامان کی بہت بڑی مقدار اُن کے قدموں میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھیر کی جا سکتی تھی۔ ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میرے پروردگار نے مجھے یہ پیشکش کی کہ بطحائے مکہ کے علاقہ کو میرے لیے سونا بنادے لیکن میں نے عرض کی ''اے میرے پروردگار! ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن سیر ہو کر کھاؤں اور دوسرے دن بھوکا رہوں۔ جس دن بھوکا رہوں تجھے یاد کروں اور تیری جناب میں گڑگڑاؤں اور جس دن سیر ہو کر کھاؤں تیری حمد کروں اور تیرا شکر بجالاؤں''۔ اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ رسولِ پاکؐ نے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی زندگی اس طرح بسر کی کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دو روز متواتر آپ نے جَو کی روٹی کھائی ہو''۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے ''بارہا ایسا ہوا کہ آپ کے ہاں ایک صاع (تین چار سیر) کے برابر بھی کوئی جنسِ خوردنی نہ ہوتی حالانکہ آپؐ کی نو بیویاں تھیں''۔ اور اگر کبھی ڈھیروں دولت آپ کے پاس آجاتی تو آپؐ سب کچھ حاجتمندوں میں تقسیم کر دیتے۔

ضروری گذارش

خریداران ترجمان القرآن و ایجنٹ صاحبان کی خدمت میں گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں جو کہ آپ کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ نہایت خوشخط اور واضح الفاظ میں مع ڈاک خانہ تحصیل و ضلع بھی درج ہونا چاہیے۔

ان امور کی پابندی کے بغیر دفتر کو عدم تعمیل کی شکایت کا ذمہ دار ٹھیرانا سراسر زیادتی ہوگی۔

مینیجر ترجمان القرآن

اچھرہ — لاہور

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن

ہمارے درج ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہوسکتی ہے

۱۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور
۲۔ فیروز سنز لیمٹڈ، دی مال، لاہور
۳۔ مکتبہ تنویر القرآن اُردو بازار لاہور
۴۔ نورسی پبلیکیشنز، لیاقت آباد کراچی
۵۔ مکتبہ تعمیر افکار اسلامی بالائی منزل حسین ڈیکوریشن ناظم آباد کراچی
۶۔ شیخ سنز، اُردو منزل، اُردو بازار کراچی
۷۔ مجدد صاحب برات حضرو ضلع کیمبل پور
۸۔ اقبال بک ڈپو سمرسٹ سٹریٹ صدر کراچی
۹۔ مسعود علی رضوی رضوان آباد فیڈرل بی ایریا منصورہ کراچی ۳۸
۱۰۔ اتحاد بک ڈپو، گاڑی کھاتا حیدر آباد
۱۱۔ مکتبہ اسلامی، کورٹ روڈ حیدر آباد
۱۲۔ رحمان نیوز ایجنسی، شارع فاطمہ جناح کوئٹہ
۱۳۔ گوشۂ ادب سرکلر روڈ کوئٹہ
۱۴۔ مکتبہ اسلامی معرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد
۱۵۔ مصاحب علی صاحب امیر جماعت اسلامی نواب شاہ
۱۶۔ عجائب سٹورز (رجسٹرڈ) فرئیر روڈ سکھر۔
۱۷۔ مکتبہ اسلامیہ کھیوڑہ ضلع جہلم۔
۱۸۔ ملت بک ڈپو ریلوے روڈ رحیم یار خاں
۱۹۔ عزیز اینڈ سنز شاہی بازار لاڑکانہ
۲۰۔ امداد علی قادری مکتبہ اسلامی قنبر علی خاں
۲۱۔ مکتبۂ احیائے ملت کپ بازار ملتان
۲۲۔ ضیا بک ڈپو، چمن بازار ہارون آباد
۲۳۔ قاری محمد عبداللہ صاحب مسجد گول چوک اوکاڑہ
۲۴۔ راز دین سلیم امیر جماعت اسلامی، لائل پور۔
۲۵۔ حاجی دین محمد صاحب ماموں کانجن
۲۶۔ ادارۂ انبیائہ کمالیہ
۲۷۔ خان زمان خان اینڈ کو، غلہ منڈی سرگودھا۔
۲۸۔ چوہدری راجولی صاحب مشین محلہ جہلم۔
۲۹۔ مولوی غلام رسول صاحب منڈی بہاء الدین
۳۰۔ مکتبہ افکار اسلامی پہلا بازار تلیاڑاں راولپنڈی۔
۳۱۔ مکتبہ اسلامیہ منڈی بازار لالہ موسیٰ
۳۲۔ عبدالعزیز دوکان ۱۲۔۱ ایریا مارکیٹ واہ کینٹ
۳۳۔ شیخ سعید احمد خاکسار مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈی جی خان
۳۴۔ خواجہ محمد یونس کندھکوٹ
۳۵۔ حکیم محمد اسحاق حویلیاں (۳۶) فیض محمد ہری پور ہزارہ
۳۷۔ شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ
۳۸۔ مکتبہ اسلامی، بنک روڈ، مردان
۳۹۔ عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار ڈیرہ اسمعیل خان
۴۰۔ عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں بنوں شہر
۴۱۔ ضیاء بک ڈپو بنور روڈ منگورہ
۴۲۔ میاں محمد شفیع صاحب آڑھن مرچنٹ جناح چوک میاں چنوں
۴۳۔ حاجی محمد اسماعیل مکتبہ اسلامی برتن منڈی میرپور خاص
۴۴۔ یونائیٹڈ بکسیلرز اینڈ سٹیشنرز اُردو بازار کراچی
۴۵۔ سردار محمد اشرف خاں صاحب۔ آزاد کشمیر کلاتھ اینڈ جنرل سٹور بالمقابل ہائی سکول غازی۔
۴۶۔ پاک نیوز ایجنسی سٹیشنرز اینڈ بکسیلرز تربت ضلع مکران